اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ ؕ وَ لَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ﴿۴۵﴾

(اے) پڑھتا رہ جو تیری طرف کتاب سے وحی کیا جاتا ہے اور نماز کو قائم رکھ۔ نماز بے حیائی اور برائی سے روک دیتی ہے، اور اللہ کا یاد کرنا یقیناً سب سے بڑھ کر ہے۔ اور اللہ جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔ (2562)

2562- **نماز کے بدی سے روکنے پر عقلی دلیل:** ﴿اُتْلُ﴾ اور ﴿اَقِمِ﴾ کے احکام عام ہیں۔ اور ان دونوں باتوں کو اکٹھا اس لیے کیا کہ اصل غرض تو یہ بتانا ہے کہ قرآن کریم سے تزکیہ نفس انسانی ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ﴾ اور اسے ایک عظیم الشان نشان ٹھہرایا گیا ہے اور نماز سے بھی تزکیہ ہوتا ہے۔ تو یہ دونوں درحقیقت ایک ہی چیز ہیں۔ اس لیے کہ نماز میں بھی تلاوت قرآن کا حصہ ہی بیشتر ہے۔ زائد بات صرف اس قدر ہے کہ عظمت الٰہی کا جو پرتو قرآن کے پڑھنے سے قلب انسانی پر پڑتا ہے اس کے مطابق نماز میں انسان مختلف ہیئتیں اختیار کرتا ہے تاکہ وہ پرتو اپنے کمال کو پہنچے۔ اور یہاں دو باتوں کا ذکر ہے۔ ان میں سے پہلی بات یہ ہے کہ نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روک دیتی ہے۔ اس پر دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ کیا یہ نرا دعویٰ ہے یا فی الواقع نماز میں کوئی ایسی بات پائی جاتی ہے جسے عقل صحیح تسلیم کر سکے کہ اس کی وجہ سے انسان بدیوں سے رک جاتا ہے۔ اور دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر عقلی دلائل پائی بھی جائیں تو کیا یہ امر واقع بھی ہے کہ نماز برائیوں سے روک دیتی رہی ہے۔ جہاں تک دلائل عقلی کا سوال ہے فی الواقع عبادت الٰہی اور پھر عبادت کی وہ طرز جو اسلامی نماز میں پائی جاتی ہے انسان کو بدیوں سے روک کر نیکی کی طرف لانے کا سب سے زبردست ہتھیار ہے۔ عبادت تین باتوں کے جمع ہونے کا نام ہے۔ یعنی معبود کی طرف کامل توجہ، اس کی حمد و ستائش، اس سے دعا کرنا۔ ان تینوں باتوں میں سے کوئی حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ معبود کی عظمت کا احساس دل میں پیدا نہ ہو اور اس کی عظمت کا احساس انسان کے دل میں ایک تبدیلی پیدا کر دیتا ہے، جس سے اس کے سارے خیالات متاثر ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ قلب انسانی قدرت نے ایسا بنایا ہے کہ جس چیز کی عظمت کا احساس دل میں پیدا ہو جائے اس کے خلاف دل میں خیالات پیدا نہیں ہوتے۔ جن لوگوں کے دلوں پر اپنے پیر کی عظمت کا اثر ہوتا ہے وہ پیر کے حکم کے خلاف کچھ نہیں کرتے، جن پر حکام کی عظمت کا اثر ہو وہ حکام کے خلاف کچھ نہیں کرتے۔ اسلام نے وہ طریق عبادت کا سکھایا ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی عظمت کا اثر دل پر ہو۔ اسی لیے عبادت میں تمام ارکان ایسے رکھے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کی عظمت کا اثر دل پر پیدا ہوتا ہے۔ دست بستہ کھڑے ہونا، جھکنا، سجدہ کرنا، مؤدب بیٹھنا۔ پھر ہر ایک حالت میں اس کے مناسب حال اذکار رکھے ہیں، پھر نماز کو دن رات پر تقسیم کر کے ہر روز پانچ بار انسان کے قلب پر اس کی عظمت الٰہی کے وارد کرنے کی طرز سکھائی ہے۔ کیونکہ جب انسان سوتا ہے یا اپنے کاروبار میں مشغول ہوتا ہے اس کا دل دوسری طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ بار بار اس کو دوسرے اشغال سے ہٹا کر ذکر الٰہی کی طرف لانے میں یہ حکمت ہے کہ تا قلب کے بار بار اس طرف متوجہ ہونے سے اس میں وہ قوت پیدا ہو جائے کہ دوسرے اشغال کے اندر بھی اصل حکومت خیالات انسانی پر عظمت الٰہی کی ہو۔

وَ لَا تُجَادِلُوْۤا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ۖۗ اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَ قُوْلُوْۤا اٰمَنَّا بِالَّذِیْۤ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ وَ اِلٰهُنَا وَ اِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۴۶﴾

اور اہل کتاب سے جھگڑا نہ کرو، مگر ایسے طریق سے جو نہایت اچھا ہو، سوائے اس کے جو ان میں سے ظالم ہیں۔ اور کہو ہم اس پر ایمان لائے جو ہماری طرف اتارا گیا اور تمہاری طرف اتارا گیا اور ہمارا معبود اور تمہارا معبود ایک ہے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔ (2563)

ہاں یہ سچ ہے کہ یہ سب باتیں پہلے دن حاصل نہیں ہوتیں، بلکہ جس طرح ہر ایک بلند مقام کو حاصل کرنے کے لیے انسان کو لگاتار ایک مدت تک محنت کرنی پڑتی ہے، اسی طرح نماز کی حالت ہے۔ پہلے پہلے اکثر دلوں میں چونکہ خیالات نفسانی اور شہوات کا غلبہ ہوتا ہے اس لیے انسان کی کوشش کے باوجود بعض وقت اسے ناکامی حاصل ہوتی ہے۔ جو لوگ ذرا سی ناکامی پر ہمت ہار دیتے ہیں وہ اس بلند مرتبہ کے حاصل کرنے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ کامیابی کا اصل گر یہی ہے کہ ہر ناکامی کے بعد از سر نو اور پہلے سے بڑھ کر کوشش کی جائے۔ ایک مدت کی جدوجہد کے بعد انسان دیکھ لے گا کہ نماز نے اسے اس مقام پر پہنچا دیا جس کا وعدہ قرآن کریم کرتا ہے۔ یعنی ہر بے حیائی اور بدی سے اس کی طبیعت متنفر ہو جاتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ جس شخص کی نماز اسے بدی سے نہیں روکتی اس کی نماز نہیں ہوتی۔ افسوس ہے کہ آج مسلمانوں نے اپنے اعمال سے نماز کو بھی بدنام کر رکھا ہے۔

دوسرا سوال یہ تھا کہ کیا کبھی نماز نے ایسا کر کے دکھایا بھی ہے؟ سو اس کی نہایت کھلی مثال تو صحابہ رضی اللہ عنہم کی زندگیاں ہیں کہ کس طرح اس نماز نے انہیں گناہ کی غلامی کی ذلیل سے ذلیل حالت سے نکال کر گناہ سے نجات کے ایسے بلند مقام پر کھڑا کر دیا جس کا اعتراف اعدائے اسلام تک کو کرنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ اسلام میں سینکڑوں نہیں ہزاروں کی تعداد میں وہ لوگ ہوئے ہیں جن کی زندگیاں اس پاک اصول کی روشن دلیل تھیں۔

دوسری بات جو یہاں بیان کی ہے وہ ﴿وَ لَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ ہے۔ اس کے معنی سمجھنے میں اکثر لوگوں کو غلطی لگی ہے۔ ابن جریر میں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے عبداللہ بن ربیعہ سے پوچھا کہ کیا تم ان الفاظ کا مطلب جانتے ہو؟ کہا ہاں۔ اس سے مراد نماز میں تسبیح و تکبیر وغیرہ اور قراءت قرآن ہے۔ آپ نے فرمایا یہ نہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے اللہ کو یاد کرنے سے بڑھ کر اللہ کا تمہیں یاد کرنا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ﴿فَاذْكُرُوْنِیْۤ اَذْكُرْكُمْ﴾ یعنی جب بندہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا ذکر کرتا ہے۔ اور اللہ کا بندہ کا ذکر کرنا اسے شرف و کرامت کا عطا فرمانا ہے۔ ان الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ نماز ایک طرف انسان کو بدی اور بے حیائی سے روکتی ہے تو دوسری طرف انسان کے اللہ کے ذکر کرنے پر اللہ تعالیٰ اسے شرف اور بزرگی عطا فرماتا ہے۔ گویا انسان نہ صرف بے گناہی کے مرتبہ کو حاصل کر لیتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ اور بھی اس کے مرتبہ کو بڑھاتا ہے اور اپنی راہ میں بڑے بڑے کام کرنے کی طاقت دیتا ہے۔

2563 - **طریق مجادلہ:** جب تزکیہ نفس انسانی اصل غرض قرآن ہے تو ان راہوں سے بچنا ضروری ہوا جن سے اصل غرض کو نقصان پہنچے۔ ایک

وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۚ وَ مِنْ هٰۤؤُلَآءِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَ مَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَاۤ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۷﴾

اور اسی طرح ہم نے تیری طرف کتاب اتاری، سو وہ لوگ جنہیں ہم نے کتاب دی اس پر ایمان لاتے ہیں، اور ان میں سے (بھی) وہ ہیں جو اس پر ایمان لاتے ہیں۔ اور ناشکروں کے سوائے ہماری آیتوں کا کوئی انکار نہیں کرتا۔ (2564)

مذہب کی طرف دعوت دینے میں لوگ اکثر حد سے گزر کر دوسرے مذاہب اور ان کے بزرگوں پر سختی کرنے لگتے ہیں۔ بلکہ نہایت ناپاک اور ناشائستہ الفاظ ان کے متعلق استعمال کرتے ہیں۔ اس کی مثال ہمارے اس مہذب زمانہ میں عیسائیت میں اور اس کے نقش قدم پر چل کر آریہ سماج میں ملتی ہے، جنہوں نے جوش تبلیغ میں وہ طریق مجادلہ کا اختیار کیا ہے جس سے مذہب کی اصل غرض ہی مفقود ہوگئی ہے۔ اس لیے ایک مسلمان کو بتایا کہ اپنے مذہب کی طرف دعوت دیتے وقت اس بات کو مدنظر رکھے کہ اصل غرض یعنی تزکیہ نفس کو نقصان نہ پہنچے۔ اور مجادلہ میں پہلی بات یہ بتائی کہ اہل کتاب یعنی ہر مذہب کے پیروؤں کے ساتھ احسن طریق سے مجادلہ کرو۔ جس میں یہ سکھایا کہ دوسرے مذاہب پر کسی قسم کی زیادتی نہ کرو، نہ ان کے بزرگوں کے حق میں کوئی بری بات کہو اور اس کی وجہ بھی ساتھ ہی بتادی۔ یعنی یہ کہ تم اس پر بھی ایمان لاتے ہو جو اُن پر اتارا گیا، اور جس پر انسان ایمان لاتا ہے اس کی ہتک نہیں کرسکتا۔ اور اس ایک فقرہ ﴿اٰمَنَّا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ﴾ میں یہ بھی بتادیا کہ انہیں نرمی سے سمجھاؤ کہ ہم تمہارے بزرگوں کو بھی مانتے ہیں، اس لیے محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے سے کسی اچھی بات کو ترک نہیں کرنا پڑتا۔ صرف بعض اچھی باتیں جن سے دوسرے مذاہب محروم ہیں وہ انسان اور اختیار کرلیتا ہے۔ اور ﴿اِلٰهُنَا وَ اِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ﴾ میں اصول مقابلہ مذاہب کی طرف توجہ دلائی کہ حقیقی معبود تمہارا اور ہمارا ایک ہے، اس لیے کہ ایک خدا کے تم بھی قائل ہو۔ اور یہ جو استثناء کیا ﴿اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ﴾ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ عامہ رویہ تو یہ ہونا چاہیے، مگر بعض وقت ظالم مخالف جب حد سے گزر جاتا ہے تو اس کو متنبہ کرنے کے لیے کچھ سختی کا طریق بھی اختیار کرنا پڑتا ہے۔ ظالم نہ تو دلائل کی پروا کرتا ہے اور نہ نرمی سے کچھ فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس لیے اس کو مناسب طریق پر اور حدود کے اندر رہ کر سختی سے سمجھانا بھی ضروری ہوجاتا ہے۔ یہاں جنگ اور جزیہ کا خیال بالکل بے معنی ہے۔ مکی سورتوں میں جنگ اور جزیہ کا کیا تعلق؟ اور نہ ہی الفاظ اس خیال کی برداشت کرتے ہیں۔

2564- ﴿كَذٰلِكَ اَنْزَلْنَاۤ﴾ یعنی سابقہ کتب کی تصدیق کرتے ہوئے ہم نے اس کتاب کو تجھ پر نازل کیا۔ اور ﴿مِنْ هٰۤؤُلَآءِ﴾ سے مراد اہل عرب ہیں جن کی طرف پہلے کوئی وحی نہ آئی تھی۔ ایسی کتاب کا انکار کافر ہی کرسکتے ہیں جو قوائے انسانی کو نشوونما دینا نہیں چاہتے۔

وَ مَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّ لَا تَخُطُّهٗ بِیَمِیْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۴۸﴾

اور تو اس سے پہلے کوئی کتاب نہ پڑھتا تھا اور نہ اسے اپنے دائیں ہاتھ سے لکھتا ہے اس صورت میں (اس کو) باطل کہنے والے شک کرتے ہیں۔ (2565)

2565- ﴿تَخُطُّهٗ﴾ تَخُطُّ۔ خَطَّ اسے کہا جاتا ہے جس کے لیے طول ہو اور اس سے مراد کتابت بھی لی جاتی ہے۔ (غ)

رسول اللہ ﷺ کے امی ہونے سے قرآن کی حقانیت پر ایک دلیل:

قرآن کریم نے ایک اعلیٰ درجہ کا مذہبی اصول قائم کیا ہے۔ یعنی یہ کہ سب مذاہب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور سب نے بالآخر ایک معبود حقیقی کو تسلیم کیا ہے۔ یہ ایک ایسا اصول ہے جسے کوئی شخص سوائے اس کے کہ دنیا کے تمام مذاہب سے خود واقفیت حاصل کرے، یعنی خود ان کی کتابوں کو پڑھے قائم نہیں کرسکتا۔ آج عیسائیوں کو کس قدر مصیبت کے بعد دنیا کے حالات کو دیکھ کر اور ان کی اصل کتابوں کو پڑھ کر آخر اس کے قریب قریب ماننا پڑا ہے کہ تمام مذاہب میں کچھ نہ کچھ صداقت ہے۔ یہ رسول اللہ ﷺ کے تیرہ سو سال بعد ساری دنیا میں پھر کر اور ساری کتابوں کو پڑھ کر ان لوگوں کو مجبوراً تسلیم کرنا پڑا ہے مگر رسول اللہ ﷺ نہ دنیا میں پھرے نہ کوئی کتاب آپ نے پڑھی۔ اس لیے اس اصول کو بیان کرکے اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ محمد رسول اللہ ﷺ تو پڑھنا نہ جانتے تھے۔ اگر پڑھنا جانتے ہوتے تو کوئی شک کی گنجائش ہوسکتی تھی کہ یہ اصول انہوں نے خود بنالیا ہے اور ﴿لَا تَخُطُّهٗ بِیَمِیْنِكَ﴾ اس لیے ساتھ بڑھایا کہ ان اصول عالیہ کے علاوہ جو قرآن کریم نے قائم کیے ہیں، اس میں ہر قسم کی تعلیم بھی جو ہمیشہ رہنے کے قابل تھی جمع کردی ہے اور یہ کام صرف ایسے شخص کا ہوسکتا تھا جو پڑھنے کے علاوہ لکھنا بھی جانتا ہو۔ ورنہ وہ ایک کتاب میں اسے جمع کیونکر کرسکتا تھا۔ جیسا کہ کہیں اور بھی میں نے لکھا ہے۔ اس بات کا دعویٰ آج ایک جرمن فاضل نے کیا ہے کہ بائبل کے اس قدر حوالہ جات اور مضامین قرآن کریم میں موجود ہیں کہ سوائے اس کے نہیں ہوسکتا کہ آنحضرت ﷺ نے بائبل کو پڑھ کر اس کے نوٹ لیے ہوں۔ اور پھر وقتاً فوقتاً مناسب موقعہ پر انہیں قرآن میں داخل کردیا ہو۔

یہاں ایک اور بیسود بحث چھیڑی گئی ہے یعنی اس پر تو اتفاق ہے کہ آنحضرت ﷺ قبل نبوت نہ لکھنا جانتے تھے نہ پڑھنا۔ سوال یہ ہے کہ آیا بعد نبوت آپ پڑھنا یا لکھنا جانتے تھے یا نہیں۔ اس بحث کے ایک یا دوسری طرف فیصلہ ہونے سے کچھ حاصل نہیں۔ لیکن یہ کہیں سے معلوم نہیں ہوتا کہ بعد نبوت رسول اللہ ﷺ نے لکھنا پڑھنا سیکھا ہو بطور اعجاز اگر آپ کو آ گیا ہو تو الگ امر ہے لیکن کتابت وحی کے بارے میں یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہمیشہ دوسرے کاتب کو بلوا کر لکھوایا کرتے تھے۔ اور خود لکھنا جانتے ہوتے تو خود ہی لکھ لیا کرتے۔ اور احادیث میں جو لفظ کِتٰبٍ آیا ہے تو اس سے مراد یہ بھی ہوسکتی ہے کہ آپ نے ایسا لکھوایا۔ ایسا ہی حدیث بخاری کے الفاظ [لَيْسَ يُحْسِنُ يَكْتُبُ] (بخاری، کتاب المغازی، باب عُمْرَةُ الْقَضَاءِ، حدیث:4251) بھی قطعی دلیل نہیں۔ اس لیے کہ ان سے یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ آپ لکھنا نہ جانتے تھے۔ بایں اگر بعد میں آپ کا لکھنا پڑھنا مانا جائے تو یہاں جو دلیل دی ہے وہ اسی طرح قائم رہتی ہیں۔

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ؕ وَ مَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَاۤ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۹﴾

بلکہ وہ ان لوگوں کے سینوں میں کھلی آیتیں ہیں جنہیں علم دیا گیا ہے اور ظالموں کے سوائے ہماری آیتوں کا کوئی انکار نہیں کرتا۔ (2566)

وَ قَالُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَ اِنَّمَاۤ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۵۰﴾

اور کہتے ہیں اس پر اپنے رب کی طرف سے نشان کیوں نہ اتارے گئے۔ کہہ، نشان صرف اللہ کے پاس ہیں اور میں صرف کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں۔

اَوَ لَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّ ذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۵۱﴾ ع 5 7 1

کیا ان کے لیے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تیری طرف کتاب اتاری ہے جو ان پر پڑھی جاتی ہے۔ یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے رحمت اور نصیحت ہے جو ایمان لاتے ہیں۔ (2567)

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ شَهِيْدًا ۚ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ الَّذِيْنَ

کہہ، میرے اور تمہارے درمیان اللہ کافی گواہ ہے۔ وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اور جو لوگ

2566- اکثر مفسرین نے یہاں هُوَ سے مراد قرآن شریف کو اور ﴿اُوْتُوا الْعِلْمَ﴾ سے مراد نبی ﷺ اور علمائے صحابہ کو لیا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ﴿اُوْتُوا الْعِلْمَ﴾ عام ہو اور مطلب یہ ہو کہ **قرآن کریم** میں نہ صرف وہ صداقتیں ہیں جو پہلی کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔ بلکہ اس میں وہ باتیں بھی ہیں جو کسی کتاب میں نہیں اور صرف اہل علم کے سینوں میں ہیں یا اہل علم آئندہ ان کو دریافت کر سکتے ہیں۔

2567- پچھلی آیت میں مطالبہ نشانات تھا۔ اس کے جواب میں اول وہیں فرمایا کہ نشان جن سے ڈرایا جاتا ہے وہ تو آ کر رہیں گے جس کی مزید تصریح [آیت نمبر: 53, 54] میں موجود ہے۔ مگر یہاں ایک نہایت لطیف بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ کیا **یہ نشان کافی نہیں کہ قرآن** کو قبول کر کے اور اس پر عامل ہو کر انسانوں کی زندگیاں پاک ہو جاتی ہیں اور مذہب کی جو غرض دنیا میں ہے وہ پوری ہوتی ہے۔ ایک صداقت کے صداقت ہونے کا اصلی نشان تو یہی ہے کہ اس کو قبول کرنے والے اس سے فائدہ اٹھائیں، اس سیدھی راہ کو لوگ اختیار نہیں کرتے۔

اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۵۲﴾

باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کا انکار کرتے ہیں وہی نقصان اٹھانے والے ہیں۔

وَ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ؕ وَ لَوْ لَاۤ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ ؕ وَ لَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۳﴾

اور تجھ سے عذاب کے لیے جلدی کر رہے ہیں۔ اور اگر ایک وقت مقرر نہ ہوتا تو عذاب ان پر آچکا ہوتا۔ اور وہ ان پر اچانک آجائے گا اور انہیں خبر (بھی) نہ ہوگی۔ (2568)

يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ؕ وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۙ﴿۵۴﴾

تجھ سے عذاب کے لیے جلدی کر رہے ہیں اور یقیناً دوزخ نے کافروں کو گھیرا ہوا ہے۔ (2569)

يَوْمَ يَغْشٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ وَ يَقُوْلُ ذُوْقُوْا مَا

جس دن عذاب انہیں ان کے اوپر سے اور ان کے پاؤں کے نیچے سے ڈھانک لے گا اور کہے گا چکھو

2568- ﴿اَجَلٌ مُّسَمًّى﴾ یا وقت مقرر سے مراد قیامت لینا بالکل غلط ہے۔ وہ عذاب جس کے لیے وہ جلدی کر رہے تھے عذاب قیامت نہ تھا بلکہ وہی نشان ہلاکت تھا جس کے لیے وہ بار بار مطالبہ کرتے تھے کہ جب ہم تمہاری تکذیب کرتے ہیں تو ہم ہلاک کیوں نہیں ہوتے۔ چنانچہ یہی تفسیر ابن جریر نے کی ہے اور اس آیت کو نقل کیا ہے ﴿اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۲﴾﴾ [الأنفال: 32:8] ''اے اللہ اگر یہ تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا ہم پر دردناک عذاب بھیج۔'' اور ﴿اَجَلٍ مُّسَمًّى﴾ کا ذکر ان الفاظ میں ہے ﴿وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِيْهِمْ ۚ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿۳۳﴾﴾ [الأنفال: 33:8] ''اور اللہ ایسا نہ تھا کہ ان کو عذاب دیتا حالانکہ تو ان میں تھا اور اللہ ان کو عذاب دینے والا نہ تھا حالانکہ وہ استغفار کرتے ہوں۔'' اور ایک قول یوم بدر کے متعلق ہے۔ (ر)

2569- یہاں بھی جس عذاب کے لیے جلدی کرتے ہیں وہی عذاب دنیا ہے مگر جواب میں فرمایا کہ جہنم نے کافروں کا احاطہ کیا ہوا ہے۔ یعنی یہ عذاب دنیا تو کیا ہے اس سے بڑا عذاب بھی ان کے لیے موجود ہے۔ گویا بتایا ہے کہ دنیا کا عذاب تو صرف بطور پیش خیمہ ہے اور یا ﴿جَهَنَّمَ﴾ سے مراد یہاں ان کے اعمال بد کے نتائج ہیں جو فی الحقیقت ان کو گھیرے ہوئے ہیں، مگر وہ انہیں دیکھتے نہیں۔ اگلی آیت سے دوسرے معنی کی تائید ہوتی ہے۔

كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۵﴾

جو تم عمل کرتے تھے۔(2570)

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾

اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو! میری زمین فراخ ہے۔ سو میری ہی عبادت کرو۔(2571)

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۵۷﴾

ہر شخص موت (کا مزہ) چکھنے والا ہے۔ پھر تم ہماری طرف ہی لوٹائے جاؤ گے۔

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿۵۸﴾

اور جو لوگ ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں ہم ضرور انہیں جنت کے بلند مقامات میں جگہ دیں گے جس کے نیچے نہریں بہتی ہیں، اسی میں رہیں گے۔ کام کرنے والوں کا اجر کیا ہی اچھا ہے۔

الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۵۹﴾

جو صبر کرتے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔

وَ كَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَ اِيَّاكُمْ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶۰﴾

اور کتنے جاندار ہیں جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے۔ اللہ انہیں رزق دیتا ہے اور تمہیں بھی۔ اور وہ سننے والا جاننے والا ہے۔(2572)

2570- مفسرین نے عموماً اس سے عذاب جہنم مراد لیا ہے۔ مگر خود قرآن کریم میں دوسری جگہ یہی لفظ اسی عذاب دنیا پر آئے ہیں ﴿قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّ يُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ﴾ [الأنعام: 65:6] ''کہہ وہ اس پر قادر ہے کہ تم پر تمہارے اوپر سے عذاب بھیجے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے یا تمہیں کئی فرقے بنا کر ملا دے اور تم میں سے بعض کو بعض کی لڑائی (کا مزہ) چکھا دے۔'' جس کے لیے [دیکھو نمبر: 959]

2571- ایک خدا کی عبادت کو وسعت زمین سے کیا تعلق ہے۔ اس میں صاف اشارہ ہجرت کی طرف ہے، یعنی اگر ایک جگہ تمہیں دکھ ملتا ہے تو دوسری جگہ چلے جاؤ۔ مجاہد سے [فَهَاجِرُوْا اَوْ جَاهِدُوْا] اور ابن زید سے ہے کہ اس سے مراد [مَنْ كَانَ بِمَكَّةَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ] (ج) اور یا مراد ہے کہ بدوں کی صحبت سے الگ ہو جاؤ۔

2572- روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مدینہ کی طرف ہجرت کا حکم دیا تو لوگوں نے کہا کہ وہاں ہمارے معاش کی کیا سبیل ہوگی، جس پر

وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۶۱﴾

اور اگر تو ان سے پوچھے کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور سورج اور چاند کو کام میں لگایا، تو کہیں گے اللہ نے۔ پھر کہاں سے الٹے پھر جاتے ہیں۔

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَ يَقْدِرُ لَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۶۲﴾

اللہ اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے روزی فراخ کر دیتا ہے اور اس کے لیے تنگ کرتا ہے (جس کے لیے چاہتا ہے) اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۶۳﴾ ع 6 12 2

اور اگر تو ان سے پوچھے کون بادل سے پانی اتارتا ہے پھر اس کے ساتھ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتا ہے؟ تو وہ کہیں گے اللہ۔ کہہ، سب تعریف اللہ کے لیے ہے۔ بلکہ ان میں سے بہت عقل سے کام نہیں لیتے۔

وَ مَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَاۤ اِلَّا لَهْوٌ وَّ لَعِبٌ ؕ وَ اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۴﴾ وقف لازم

اور یہ دنیا کی زندگی تو صرف بے حقیقت شغل اور کھیل ہے اور آخرت کا گھر وہی یقیناً (اصل) زندگی (ہے) کاش وہ جانتے۔ (2573)

فَاِذَا رَكِبُوْا فِی الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ

سو جب وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں اللہ کو پکارتے ہیں، اسی

یہ آیت نازل ہوئی۔ (ر) یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ رزق جہاں جاؤ گے مل جائے گا۔ رزق ساتھ اٹھائے پھرنا ضروری نہیں۔

2573- ﴿اَلْحَيَوَانُ﴾ حَيَاةٌ یعنی زندگی کی جائے قرار ہے اور یہ دو طرح پر ہے۔ ایک وہ جس کے لیے حواس ہیں، دوسرا وہ جس کے لیے بقائے ابدی ہے اور یہی یہاں مراد ہے۔ اور بعض اہل لغت کے نزدیک حَيَوَانٌ اور حَيَاةٌ ایک ہی ہیں۔ (غ)

دنیا کی زندگی سے مراد کھانا پینا اور حوائج جسمانی کا پورا کرنا ہے۔ اور آخرت کے گھر سے وہ امور ہیں جو اخلاق اور روحانیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اول الذکر موت کے ساتھ منقطع ہو جانے والی چیزیں ہیں۔ اس لیے جو صرف انہیں کو غرض زندگی ٹھہرا لیتا ہے وہ گویا لہو لعب میں مصروف ہو گیا۔ کیونکہ حقیقی غرضِ زندگی سے محروم رہ گیا۔ پس جو حقیقی غرض زندگی کو اختیار کرتا ہے وہی کامیاب ہوگا۔

مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿٦٥﴾

کے لیے فرمانبرداری کو خالص کرتے ہوئے۔ پھر جب انہیں بچا کر خشکی پر لے آتا ہے تو وہ شرک کرنے لگتے ہیں۔

لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۙ وَ لِيَتَمَتَّعُوْا ۟ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿٦٦﴾

تاکہ اس کی ناشکری کریں جو ہم نے انہیں دیا ہے اور تاکہ وہ عارضی فائدہ اٹھائیں، سو جان لیں گے۔

اَوَ لَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّ يُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ؕ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَ بِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَكْفُرُوْنَ ﴿٦٧﴾

کیا انہوں نے غور نہیں کیا کہ ہم نے حرم کو امن والا بنایا ہے اور لوگ ان کے اردگرد سے اچک لیے جاتے ہیں۔ تو کیا باطل پر ایمان لاتے اور اللہ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں۔ (2574)

وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهٗ ؕ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿٦٨﴾

اور اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ بنائے یا حق کو جھٹلائے جب وہ اس کے پاس آ گیا ہو۔ کیا کافروں کا ٹھکانا دوزخ میں نہیں ہے۔ (2575)

وَ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٦٩﴾ ع 7 6 3

اور جو لوگ ہمارے لیے محنت اٹھاتے ہیں ہم یقیناً انہیں اپنے رستوں پر چلائیں گے، اور اللہ یقیناً نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ (2576)

2574- عرب میں عام طور پر بڑی بے امنی تھی اور کسی شخص کی جان محفوظ نہ تھی۔ اسی کی طرف ﴿يُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ﴾ میں اشارہ ہے۔ ایسے ملک میں جہاں چاروں طرف بے امنی ہو حدود حرم کے اندر کسی شخص کا دوسرے پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ کر سکنا اللہ تعالیٰ کی قدرت کا نشان تھا جس کی طرف یہاں توجہ دلائی ہے۔

2575- گویا دونوں فریقوں میں سے جب ایک اتنا بڑا ظلم اختیار کر رہا ہے تو ضرور ہے کہ اسے سزا ملے اور دوسرا فریق کامیاب ہو۔

2576- پس جس کے ساتھ اللہ ہو وہی کامیاب ہوگا۔

سورۃ الروم

نام:

اس سورت کا نام الرُّوْمُ ہے اور اس میں 6 رکوع اور 60 آیتیں ہیں۔ یہ سورت شروع اس مضمون سے ہوتی ہے کہ روم والے جو اس وقت عیسائی تھے ایرانیوں کے ہاتھ سے مغلوب ہو گئے ہیں، لیکن نو سال کے اندر اندر وہ ایران پر غالب آ جائیں گے۔ مگر صرف اس خبر کا دینا مقصود نہیں بلکہ اصل بات جو بتائی ہے وہ یہ ہے کہ جو وقت رومیوں کے ایرانیوں پر غلبہ کا ہے وہی وقت مسلمانوں کے اپنے دشمنوں پر غلبہ کا ہے اور دونوں کو اکٹھا کرنے کی وجہ یہ ہے کہ پیشگوئی کے وقت یہ دونوں قومیں مغلوب تھیں اور مغلوب بھی ایسی کہ ان کے اٹھنے اور ایک طاقتور دشمن پر غالب آنے کا خفیف سے خفیف قرینہ بھی نہ تھا۔ اس تعلق کی وجہ سے اس سورت کا نام جس میں غلبہ اسلام کی صریح پیشگوئی ایک معین وقت کے اندر پورا ہونے والی کی ہے الرُّوْمُ رکھا گیا۔

خلاصہ مضمون:

① پہلے رکوع میں رومیوں کے مغلوب ہونے کے بعد غالب آنے کی پیشگوئی کر کے اور اس کی میعاد نو سال قرار دے کر صراحت سے فرمایا کہ عین وہی وقت مسلمانوں کی کامیابی کا بھی ہوگا۔

② دوسرے میں مومن اور کافر کے انجام کا مقابلہ ہے،

③ تیسرے میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے نشانات کی طرف توجہ دلائی ہے۔

④ چوتھے میں بتایا ہے کہ اسلام فطرت انسانی کا مذہب ہے اور اس میں بھی یہی اشارہ کیا ہے کہ یہ یقینی بات ہے کہ جو مذہب فطرت انسانی کے مطابق ہے وہ آخر کار دنیا میں مقبول ہو۔

⑤ پانچویں رکوع میں بتایا کہ کل عالم میں فساد پھیل چکا تھا اور اب اسلام کے آنے سے ایک عظیم الشان انقلاب روحانی کی بنیاد رکھی گئی ہے جس کے آثار ظاہر ہو رہے ہیں۔

⑥ چھٹے رکوع میں بتایا کہ حق کی مخالفت آخر کار دور کر دی جائے گی۔

تعلق:

ان چاروں سورتوں کا مضمون تو ایک ہی ہے لیکن یہاں اسلام کی آخری کامیابی کو دو پہلوؤں سے واضح الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ اول: مسلمانوں کے ایک معین میعاد کے اندر اس وقت کے دشمنوں پر غالب آنے کی خبر ہے۔ دوسرے یہ بتا کر کہ اسلام مذہب فطرت ہے اور فطرت انسانی آخر کار اس کے سامنے سر جھکائے گی۔

اٰيَاتُهَا 60 (30) سُوْرَةُ الرُّوْمِ مَكِّيَّةٌ (84) رُكُوْعَاتُهَا 6

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ	اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے
الٓمّٓ ۚ ①	میں اللہ کامل علم رکھنے والا ہوں۔
غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۙ ②	رومی مغلوب ہو گئے۔(2577)
فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَ هُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۙ ③	قریب سرزمین میں۔ اور وہ اپنے مغلوب ہونے کے بعد۔
فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ؕ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَ مِنْۢ بَعْدُ ؕ وَ يَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ ④	چند سال میں غالب آجائیں گے۔ پہلے اور پیچھے، اللہ (تعالیٰ) کا ہی حکم ہے اور اس دن مومن خوش ہوں گے۔

زمانۂ نزول:

یہ سورت بالاتفاق کل کی کل مکی ہے اور اس کا زمانہ نزول یقین کے ساتھ پانچواں یا چھٹا سال بعثت کا کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ یہی وہ وقت ہے جب رومیوں کے مغلوبیت انتہا کو پہنچ گئی اور اہل فارس نے ان کے تمام صوبہ جات یکے بعد دیگرے لے لیے۔

2577- ﴿الرُّوْمُ﴾ سلطنت روما کے لوگ اپنے آپ کو رومی کہتے تھے اور یہ عیسائی تھے۔

سلطنت روما کی یہ مغلوبیت جس کا یہاں ذکر ہے ایرانیوں کے ہاتھ سے وقوع میں آئی۔ ان دونوں سلطنتوں کا مقابلہ مدت سے چلا آتا تھا۔ آخر 602 عیسوی میں وہ عظیم الشان جنگ شروع ہوئی جو خسرو ثانی شاہ ایران نے رومیوں کے ساتھ شروع کی۔ ''اس کی افواج نے سیریا اور ایشیائے کوچک کو لوٹا اور 608 عیسوی میں کیلسیڈون پر بڑھیں۔ 613ء و 614ء میں جرنیل شہ براز نے دمشق اور یروشلم کو فتح کر لیا اور مقدس صلیب کو لے گیا۔ جلد ہی بعد میں مصر بھی فتح ہو گیا۔ رومی کوئی مقابلہ نہ کر سکے کیونکہ ایک طرف اندرونی جھگڑوں سے اور دوسری طرف سلافیوں کے دباؤ سے وہ بہت ہی کمزور ہو رہے تھے۔''
(انسائیکلوپیڈیا بریٹینیکا)

بِنَصْرِ اللّٰهِ ؕ یَنْصُرُ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ۝۵

اللہ کی مدد سے، وہ جس کی چاہتا ہے مدد کرتا ہے اور وہ غالب رحم کرنے والا ہے۔ (2578)

2578- ﴿اَدْنَی الْاَرْضِ﴾ کے لفظی معنی قریبی سرزمین ہیں اور یہاں ملک عرب سے قریب مراد ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور سدی سے مروی ہے کہ مراد اس سے اردن اور فلسطین ہیں اور یہی صحیح ہے۔ اور اس لفظ کے لانے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ 614 عیسوی کا واقعہ ہے جب ایرانی دمشق اور بیت المقدس کو فتح کر کے صلیب بھی لے گئے اور یہ ان کی انتہائی مغلوبیت تھی۔ گو اس کے بعد بھی ایرانی بڑھتے ہی چلے گئے۔

جب مکہ میں ایرانیوں کے غلبہ اور رومیوں کی مغلوبیت کی خبر پہنچی تو بت پرست قریش نے خوشی کا اظہار کیا۔ اس لیے کہ وہ اہل کتاب کو اچھا نہ سمجھتے تھے۔ اور بالخصوص مسلمانوں کی مخالفت کی وجہ سے اور کچھ عرب پر ایرانیوں کے تسلط کی وجہ سے انہیں ایرانیوں کے غلبہ سے خوشی ہوئی۔ اس پر ان آیات کا نزول ہوا جن میں دو پیشگوئیاں ہیں۔ اول یہ کہ نو سال کے اندر اندر رومی اپنے دشمنوں پر فتح پالیں گے۔ دوسری یہ کہ اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کو بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد پہنچے گی اور وہ خوش ہوں گے۔ چنانچہ ابن جریر میں ہے [یَوْمَ یَغْلِبَ الرُّوْمَ فَارِسِ یَفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهِ بِنَصْرِ اللّٰهِ اِیَّاهُمْ عَلَی الْمُشْرِكِیْنَ] جس دن رومی ایران پر غالب آئیں گے اللہ اور رسول پر ایمان لانے والے اللہ کی مدد سے خوش ہوں گے جو اللہ انہیں مشرکوں کے خلاف دے گا۔ اور ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یہ بدر کا دن تھا۔ (ر) اور اگر غور کیا جائے تو ﴿بِنَصْرِ اللّٰهِ﴾ کا لفظ مومنوں کی کافروں پر فتح پر ہی صادق آسکتا ہے، اور یوں یہ پیشگوئی اپنے اندر اللہ تعالیٰ کے علم اور قدرت کا عجیب ترین نمونہ ہے۔ اور کوئی پیشگوئی صفائی میں اس سے بڑھ کر نہیں۔ ایک عرصہ دراز کے بعد ایک ایسی لمبی جنگ میں جو 602ء سے شروع ہو کر 615ء میں ختم ہوتی ہے یعنی تیرہ سال جاری رہتی ہے، سلطنت ایران سلطنت روما پر غالب آتی ہے۔ اس کا صوبہ پر صوبہ لیتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ کل صوبہ جات کو لے کر اس کے دارالخلافہ کے دروازہ پر جا موجود ہوتی ہے۔ ایسے وقت میں یہ پیشگوئی کہ یہ مغلوب سلطنت آخر کار غالب آجائے گی، کسی انسان کی طاقت میں نہیں۔ مگر اس پر بس ﴿بِضْعِ سِنِیْنَ﴾ کی شرط بڑھا دینا یعنی نو سال کے اندر اندر غالب آجائے گی۔ نہ صرف قیاس و قرائن سے باہر ہے بلکہ عین ان کے خلاف ہے۔ اور اسی پر بس نہیں کی بلکہ اس کے ساتھ ہی ایک ایسی ہی بظاہر ناممکن الوقوع بات اور ملا دی ہے یعنی یہ کہ عین اس وقت جب رومی ایران پر نو سال کے اندر اندر غالب آئیں گے مسلمان بھی مشرکین پر غالب آئیں گے۔ حالانکہ مسلمانوں کی اس وقت کوئی جماعت بھی نہیں جس کے غالب آنے کا وہم بھی کسی کو ہو سکے۔ لیکن قدرت خداوندی کا کیا عجیب نظارہ ہے کہ ایک ہی سال میں یعنی 624 عیسوی میں ہرقل نہ صرف اپنے علاقوں کو واپس لے لیتا ہے بلکہ ایران کے اندر داخل ہو کر ان کے بڑے آتشکدہ کو تباہ کر دیتا ہے اور اسی سال میں 313 مسلمان جن کے پاس ہتھیار نہیں، جو جنگ آزمودہ جوان نہیں، ایک ہزار قریش کی مسلح جمعیت پر غالب آتے ہیں۔

وَعْدَ اللّٰهِ ؕ لَا یُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝۶

اللہ کا وعدہ ہے، اللہ اپنے وعدہ کا خلاف نہیں کرتا لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۖۚ وَ هُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ۝۷

وہ دنیا کی زندگی کی ظاہر (باتوں) کو جانتے ہیں اور آخرت سے وہ بالکل غافل ہیں۔

اَوَ لَمْ یَتَفَكَّرُوْا فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ ؕ مَا خَلَقَ

کیا انہوں نے اپنے دل میں غور نہیں کیا، اللہ نے

حضرت ابوبکرؓ اور ابی بن خلف کی شرط:

اس عظیم الشان پیشگوئی پر عرب خاموش نہ رہ سکتے تھے۔ ابی ابن خلف نے بڑی شدومد سے اس کا انکار کیا اور کہا کہ ایسا نہیں ہوسکتا، واقعات اس کے خلاف ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جن کا ایمان وحی الٰہی پر پہاڑ کی طرح مضبوط تھا اس پر اس سے شرط لگائی کہ اگر تین سال میں اہل روم غالب نہ آگئے تو دس اونٹ میں دوں گا اور اگر غالب آگئے تو دس اونٹ تم سے لوں گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ علم ہوا تو آپ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ بِضْعٌ کا لفظ تو نو تک آتا ہے، اس لیے میعاد اور شرط دونوں کو بڑھا دو۔ ابی بن خلف نے اس کو منظور کیا اور شرط یہ قرار پائی کہ اگر نو سال کے اندر رومیوں نے ایران کو مغلوب نہ کیا تو ایک سو اونٹ ابوبکر رضی اللہ عنہ ابی کو دیں گے ورنہ اس سے ایک سو اونٹ لیں گے۔ چنانچہ روح المعانی میں ذیل کی روایت بیان کی گئی ہے اور ترمذی کے حوالہ سے اسے حسن قرار دیا ہے۔ [اِنَّهُ لَمَّا كَانَ یَوْمُ بَدْرٍ ظَهَرَتِ الرُّوْمُ عَلٰی فَارِسَ فَأَخَذَ اَبُوْبَكْرٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ الْخَطَرَ مِنْ وَرَثَةِ اُبَیٍّ وَ جَاءَ بِهِ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم فَقَالَ عَلَیْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ تَصَدَّقَ بِهِ] (ر) یعنی جب بدر کا واقعہ ہوا تو رومی ایران پر غالب آئے۔ پس ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ابی کے وارثوں سے شرط کا مال لیا اور اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ صدقہ کردو۔ پس یہ پیشگوئی کفار میں بھی خوب شہرت پا چکی تھی اور پھر اس کا پورا ہونا بھی ان پر اچھی طرح ظاہر ہوگیا تھا۔

دنیا کا عظیم ترین معجزہ:

اس سے بڑھ کر کون سا معجزہ ایک نبی کی صداقت کو ظاہر کرسکتا ہے۔ جن معجزات پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خدائی کی بنیاد رکھی جاتی ہے ان میں سے ایک کا بھی کوئی ثبوت اس وقت موجود نہیں۔ مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معجزہ آج بھی ایسا ثابت ہے جیسا آپ کی زندگی میں پیشگوئی کے پورا ہونے کے وقت ثابت تھا۔ اپنی صفائی کے لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ایک ہی معجزہ قیامت تک آپ کی صداقت کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔

اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ وَ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ ۝۸

آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے حق کے ساتھ اور ایک مقرر وقت تک کے لیے (رہنے کو) ہی پیدا کیا ہے۔ اور بہت سے لوگ اپنے رب کی ملاقات کا انکار کرنے والے ہیں۔ (2579)

اَوَ لَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّ اَثَارُوا الْاَرْضَ وَ عَمَرُوْهَآ اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا وَ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ؕ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝۹

کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھیں کہ ان کا انجام کیسا ہوا، جو ان سے پہلے تھے؟ وہ ان سے قوت میں بڑھ کر تھے اور انہوں نے زمین کو کاشت کیا اور اسے آباد کیا، اس سے بڑھ کر جو انہوں نے آباد کیا۔ اور ان کے پاس ان کے رسول کھلی دلائل کے ساتھ آئے، سو اللہ تو ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا۔ بلکہ وہ اپنی جانوں پر آپ ظلم کرتے تھے۔

ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓآٰى اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ كَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۱۰ ع 1 10 4

پھر ان لوگوں کا انجام جنہوں نے بدی کی بہت برا ہوا، اس لیے کہ انہوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا اور ان پر ہنسی کرتے تھے۔ (2580)

اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝۱۱

اللہ ہی پہلی بار پیدا کرتا ہے پھر اسے دوبارہ پیدا کرتا ہے، پھر اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

2579- اس سے معلوم ہوا کہ زمین اور یہ نظام عالم بھی ایک وقت مقرر کے لیے ہے اور اس پر بھی فنا کا ایک وقت آئے گا۔

2580- ﴿السُّوْٓاٰى﴾ اَسْوَء کی تانیث ہے یعنی بہت برا۔

وَ یَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ یُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۱۲﴾

اور جب (موعود) گھڑی آئے گی مجرم سخت ناامید ہو جائیں گے۔

وَ لَمْ یَكُنْ لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَآىِٕهِمْ شُفَعٰٓؤُا وَ كَانُوْا بِشُرَكَآىِٕهِمْ كٰفِرِیْنَ ﴿۱۳﴾

اور ان کے شریکوں میں سے کوئی ان کے سفارشی نہ ہوں گے اور وہ اپنے شریکوں کا انکار کرنے والے ہوں گے۔

وَ یَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ یَوْمَىٕذٍ یَّتَفَرَّقُوْنَ ﴿۱۴﴾

اور جب وہ گھڑی آئے گی اس دن الگ الگ ہو جائیں گے۔ (2581)

فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِیْ رَوْضَةٍ یُّحْبَرُوْنَ ﴿۱۵﴾

پس وہ جو ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں وہ سرسبز جگہ میں خوش ہوں گے۔ (2582)

وَ اَمَّا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَ لِقَآءِ الْاٰخِرَةِ فَاُولٰٓىِٕكَ فِی الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ﴿۱۶﴾

اور وہ جو کافر ہیں اور ہماری آیتوں کو اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلاتے ہیں، وہ عذاب میں پکڑے ہوئے ہوں گے۔

2581- یعنی اچھے اور برے الگ الگ ہو جائیں گے، جیسا آگے تفصیل سے ظاہر ہے۔ اس دنیا میں ملے جلے رہتے ہیں۔

2582- ﴿رَوْضَةٍ﴾ رَوْضٌ وہ جگہ ہے جہاں پانی جمع ہو جائے اور سبزی ہو اور یہاں جنت کے روضوں میں سے روضہ مراد ہے اور وہ اس کے خوبصورت اور لذت والے مقام ہیں اور ﴿فِیْ رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ﴾ [الشوریٰ: 22:42] ''وہ بہشت کے باغوں میں ہوں گے۔'' میں اس کی طرف اشارہ ہے جو عقبیٰ میں ظاہر طور پر ان کے لیے تیار کیا جائے گا۔ اور کہا گیا ہے کہ یہ اشارہ ان علوم و اخلاق کی طرف ہے جن کا انہیں اہل بنایا ہے، جن کے ساتھ جو شخص مخصوص ہو اس کا دل خوش اور پاکیزہ ہوتا ہے۔ (غ) اور حقیقت یہی ہے کہ جو لوگ بوجہ اپنے اخلاق اور علوم الٰہی کے یہاں طیب نفس حاصل کر لیتے ہیں وہی ان کے لیے آخرت میں ظاہری روضات کی شکل میں ظاہر ہو جائے گا۔ فی الحقیقت مومن یہاں بھی روضوں میں خوش ہوتے ہیں اور قیامت میں بھی ہوں گے۔ ایسا ہی کفار یہاں بھی عذاب میں ہوتے ہیں اور آخرت میں بھی ہوں گے۔ ہاں یہاں کی خوشیوں اور عذاب کا رنگ مخفی ہے وہاں کھلا ہوگا۔

فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِیْنَ تُمْسُوْنَ وَ حِیْنَ تُصْبِحُوْنَ ﴿۱۷﴾

سو اللہ پاک ہے جب تم پر شام ہو اور جب تم پر صبح ہو۔ (2583)

وَ لَهُ الْحَمْدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ عَشِیًّا وَّ حِیْنَ تُظْهِرُوْنَ ﴿۱۸﴾

اور آسمانوں اور زمین میں اسی کی تعریف ہے اور پچھلے پہر اور جب تم پر دوپہر ہو۔ (2584)

یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَ یُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ وَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ وَ كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ﴿۱۹﴾ ع

وہ زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے۔ اور زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتا ہے۔ اور اسی طرح تم نکالے جاؤ گے۔ (2585)

2583- ﴿تُمْسُوْنَ﴾ مَسَاءٌ۔ صَبَاحٌ کی ضد ہے اور اِمْسَاءٌ، اِصْبَاحٌ کی۔ (ل) پس ﴿تُمْسُوْنَ﴾ کے معنی ہوئے شام کے وقت داخل ہوتے ہو۔

2584- ﴿عَشِیًّا﴾ عَشِیٌّ کے لیے [دیکھو نمبر: 417] زوال آفتاب سے بعد کا وقت ہے اور رات بھی اس میں داخل ہے۔

﴿تُظْهِرُوْنَ﴾ کے معنی ہیں ظَهِیْرَۃٌ کے وقت میں داخل ہوتے ہو [دیکھو نمبر: 2345]۔

بلاشبہ ان دو آیات میں **پانچ نمازوں کا ذکر** ہے۔ شام کے وقت میں مغرب اور عشاء کی نمازیں داخل ہیں اور صبح کے وقت میں نماز فجر ہے۔ عَشِیٌّ میں نماز عصر اور تُظْهِرُوْنَ میں نماز ظہر۔ لیکن الفاظ ایسے اختیار فرمائے ہیں کہ جن سے ایک اور غرض بھی حاصل ہوتی ہے یعنی شام میں داخل ہونا روشنی سے تاریکی میں داخل ہونا ہے، اور صبح میں داخل ہونا تاریکی سے روشنی کی حالت میں آنا ہے۔ اور انسان پر بلحاظ حالات ظاہری دونوں حالتیں آتی رہتی ہیں۔ ایسا ہی عَشِیٌّ یا عصر کا وقت آفتاب کے بہت نیچے ہو جانے کا وقت ہے اور ظَهِیْرَۃٌ اس کے سب سے بلند مقام پر ہونے کا وقت ہے اور یہاں بھی اشارہ ایک انسان کی اس حالت کی طرف ہے جب اس کا آفتاب اقبال ڈھل جاتا ہے اور دوسرا اس حالت کی طرف جب وہ افق پر ہوتا ہے اور ان تمام حالات میں جو انسان کو پیش آتے رہتے ہیں۔ سبحان اللہ کی تعلیم بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر حال میں عیوب اور نقصانوں سے پاک ہے اور ان حالات مختلفہ کا انسان پر آنا انسان کی اپنی اصلاح یا کسی اور مصلحت الٰہی سے ہے۔ یا رات کے آنے میں اشارہ زمانہ جہالت کی طرف ہے اور دن کے آنے میں علم اور دین کے پھیلنے کی طرف۔

2585- **مردہ سے زندہ نکالنے سے مراد:** اِخْرَاجٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 497] ایک حالت سے نکالنے پر بھی بولا جاتا ہے اور یہاں اول زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالنے کا ذکر کیا۔ جس کے لیے [دیکھو نمبر: 398] اور چونکہ موت اور زندگی کے لفظ روحانی

وَ مِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَاۤ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ﴿۲۰﴾

اور اس کے نشانوں میں سے ہے کہ تمہیں مٹی سے پیدا کیا۔ پھر دیکھو تم انسان بن کر پھیل جاتے ہو۔ (2586)

وَ مِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَیْهَا وَ جَعَلَ بَیْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱﴾

اور اس کے نشانوں میں سے ہے کہ تمہارے لیے نفسوں سے جوڑے پیدا کیے تا کہ تم ان سے تسکین پاؤ اور تمہارے درمیان محبت اور رحم پیدا کیا۔ یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے نشان ہیں جو فکر کرتے ہیں۔ (2587)

وَ مِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَ اَلْوَانِكُمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ ﴿۲۲﴾

اور اس کے نشانوں میں سے آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا اور تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا اختلاف ہے۔ یقیناً اس میں علم والوں کے لیے نشان ہیں۔ (2588)

موت اور روحانی زندگی پر بھی بولے جاتے ہیں [دیکھو نمبر: 79] اس لیے مردہ کو زندہ سے اور زندہ کو مردہ سے نکالنے کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ ایک روحانی طور پر مردہ قوم سے زندہ قوم کو پیدا کرتا ہے اور یہی یہاں مراد ہے۔ جیسا کہ مجاہد سے مروی ہے [یُخْرِجُ الْمُؤْمِنُ مِنَ الْكَافِرِ وَ یُخْرِجُ الْكَافِرُ مِنَ الْمُؤْمِنِ](ر) اور یہی حسن کا قول ہے۔ (ج) پس ﴿كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ﴾ سے مراد بھی یہی ہے کہ تمہیں بھی ایک مردہ حالت سے نکال کر زندہ کیا جائے گا۔

2586- نشان وہی چیز ہو سکتی ہے جو سامنے موجود ہو۔ پس ہمیں مٹی سے پیدا کرنے کے یہ معنی لینا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا تھا صحیح نہیں بلکہ ہر ایک **انسان مٹی سے پیدا ہوتا ہے**۔ اور نشان یہی ہے کہ کس طرح مٹی کے اجزا کا خلاصہ درخلاصہ نکل کر ایک انسان بن جاتا ہے۔ پس وہ خدا جو ہماری آنکھوں کے سامنے مٹی سے انسان بنا کر کھڑا کرتا ہے کیا وہ ہمارے اعمال سے ایک نئی پیدائش نہیں کر سکتا۔ اسی کی طرف رکوع کی آخری آیت میں توجہ دلائی ہے کہ وہ اس پر بہت آسان ہے۔

2587- یہاں مردوں کے لیے **ان کے نفسوں سے بیبیاں** پیدا کرنے کا ذکر ہے۔ پس صرف حوا ہی حضرت آدم علیہ السلام کے نفس سے پیدا نہیں ہوئیں بلکہ سب کے لیے ازواج ان کے نفسوں سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور مراد اس سے جنس سے پیدا کرنا ہے تا کہ باہم محبت اور رحم ہو اور اس میں فکر کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی توحید پر نشان ہونے کا ذکر کیا۔ اور آگے کہیں علم والوں کے لیے، کہیں سننے والوں کے لیے، کہیں عقل سے کام لینے والوں کے لیے ایسے ہی نشانات کا ذکر کیا اور بتا دیا کہ عقل و فکر سے کام لیا جائے تو انسان کو اللہ تعالیٰ کی قدرت کے مظاہر میں صاف اس کی ہستی اور اس کی توحید کی دلائل ملتی ہیں۔

2588- **زبانوں اور رنگوں کے اختلاف** کے ذکر سے مطلب تو یہی تھا کہ اس قدر اختلافات کے باوجود تم سب انسان ایک ہی ہو۔ اور یہی

وَ مِنْ اٰیٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ ابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ ﴿۲۳﴾

اور اس کے نشانوں میں سے رات اور دن کو تمہارا سونا اور تمہارا اس کے فضل کو تلاش کرنا ہے۔ یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے نشان ہیں جو سنتے ہیں۔

وَ مِنْ اٰیٰتِهٖ یُرِیْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ یُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَیُحْیٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴿۲۴﴾

اور اس کے نشانوں میں سے ہے کہ تمہیں خوف اور امید کے لیے بجلی دکھاتا ہے اور بادل سے پانی اتارتا ہے پھر اس کے ساتھ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتا ہے۔ یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے نشان ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

وَ مِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَ الْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ؕ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً ۖۗ مِّنَ الْاَرْضِ ۖۗ اِذَاۤ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ ﴿۲۵﴾

اور اس کے نشانوں میں سے ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں۔ پھر جب وہ تمہیں زمین سے ایک آواز دے کر پکارے گا تو تم فوراً نکل پڑو گے۔[2589]

وَ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۲۶﴾

اور اسی کے ہیں جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہیں، سب اسی کے فرمانبردار ہیں۔

وَ هُوَ الَّذِیْ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ وَ هُوَ اَهْوَنُ عَلَیْهِ ؕ وَ لَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰی فِی

اور وہی ہے جو پہلی بار پیدا کرتا ہے پھر اسے دوبارہ پیدا کرتا ہے اور یہ اس پر بہت آسان ہے اور اس کی شان

وجہ ہے کہ آسمانوں اور زمین کی پیدائش کے ذکر کے ساتھ اس کو جمع کیا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوق میں ظاہری اختلاف کے اندر ایک وحدت نظر آتی ہے۔ مگر آج یہ حالت ہے کہ سفید اور سیاہ رنگ میں اس قدر فرق کر دیا گیا ہے کہ سفید رنگ حکومت کے لیے پیدا ہوا ہے اور سیاہ محکومیت کے لیے۔

2589 - اس سے مراد قیامت ہے۔ اس کا پکارنا کس رنگ میں ہوگا اسے وہی بہتر جانتا ہے۔

السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۷﴾

آسمانوں اور زمین میں بہت بلند ہے اور وہ غالب حکمت والا ہے۔

ع

ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ؕ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۲۸﴾

وہ تمہارے لیے تمہاری اپنی مثال بیان کرتا ہے۔ کیا ان میں سے جن کے تمہارے داہنے ہاتھ مالک ہیں اس رزق میں جو ہم نے تمہیں دیا ہے کوئی تمہارے شریک ہیں کہ تم (سب) اس میں برابر ہو۔ ان کی تم ایسی پروا کرتے ہو جیسی اپنی پروا کرتے ہو۔ اسی طرح ہم ان لوگوں کے لیے باتیں کھول کر بیان کرتے ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ (2590)

بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ فَمَنْ يَّهْدِيْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَ مَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۲۹﴾

بلکہ جو ظالم ہیں وہ اپنی خواہشات کی پیروی بغیر علم کے کر رہے ہیں۔ سو اسے کون ہدایت دے جسے اللہ گمراہ ٹھہرائے اور ان کے لیے کوئی مددگار نہیں۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾ ۙ

سو یکسو ہو کر دین کی طرف اپنا رخ کر، اللہ کی بنائی ہوئی فطرت پر قائم رہ جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی پیدائش کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ یہ قائم رہنے والا دین ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (2591)

2590- فطرت انسانی کو اپیل کی ہے کہ جب مالک اور مملوک، آقا اور نوکر تمہارے نزدیک برابر نہیں حالانکہ ایک ہی جیسے انسان ہیں تو مخلوق کو خالق کے برابر کس طرح ٹھہراتے ہو۔

2591- ﴿فِطْرَتَ﴾ فَطْرٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 913] اور [فَطَرَ اللّٰهُ الْخَلْقَ] سے مراد ہے اللہ تعالیٰ ایک چیز کو وجود میں لایا اور ایسی

مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَ اتَّقُوْهُ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اس کی طرف رجوع کرنے والے (رہو) اور اس کا تقویٰ

شکل پر بنایا جس سے کوئی فعل مترشح ہوتا تھا۔ پس ﴿فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا﴾ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اشارہ ہے اس کی طرف جو اس نے پیدا کیا یعنی اصل حالت میں بنایا اور لوگوں کے اندر اپنی معرفت کا حصہ مرکوز کر دیا اور ﴿فِطْرَتَ اللّٰهِ﴾ وہ ہے جو اس میں معرفت ایمان کی قوت مرکوز ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں اشارہ ہے ﴿وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ﴾ [الزخرف: 87:43] ''اور اگر تو ان سے پوچھے کس نے انہیں پیدا کیا، تو کہیں گے اللہ نے۔'' (غ) اور بخاری میں ہے [اَلْفِطْرَةُ الْاِسْلَامُ] یعنی فطرۃ اسلام ہے اور ﴿فِطْرَتَ اللّٰهِ﴾ یہاں فعل محذوف کی وجہ سے منصوب ہے [اَلْزِمُوْا فِطْرَةَ اللّٰهِ] یا [عَلَيْكُمْ فِطْرَتَ اللّٰهِ]۔

فطرت کا مذہب اسلام ہے:

جب پچھلے رکوع میں اللہ تعالیٰ کی توحید اور قدرت کے نشان بیان کیے اور یہاں پہلی آیت میں فطرت انسانی کو اپیل کی، تو اب اس کا نتیجہ یہاں بیان فرمایا کہ اسی دین پر قائم رہو جس کی طرف یہ شواہد لے جاتے ہیں اور حنیف رہو یعنی افراط و تفریط اس میں نہ ہو۔ اور قَيِّمْ میں خطاب عام ہے، اس لیے آگے سب صیغے جمع کے آتے ہیں۔ اسی کو اگلے الفاظ ﴿فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا﴾ میں واضح کیا۔ گویا بتایا کہ وہ دین فطرت اللہ ہے اور ﴿فِطْرَتَ اللّٰهِ﴾ کیا ہے؟ ﴿الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا﴾ وہ اصل حالت جس پر اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے اور بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: [مَا مِنْ مَوْلُودٍ إِلَّا يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ، فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ أَوْ يُنَصِّرَانِهِ أَوْ يُمَجِّسَانِهِ....] (صحيح البخاري، كتاب الجنائز، باب إِذَا أَسْلَمَ الصَّبِيُّ فَمَاتَ هَلْ يُصَلَّى عَلَيْهِ وَهَلْ يُعْرَضُ عَلَى الصَّبِيِّ الإِسْلاَمُ: 1358) اور پھر آپ نے یہی آیت پڑھی یعنی کوئی بچہ نہیں مگر وہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے (یعنی اصل حالت پر جو اسلام ہے) پھر اس کے والدین اسے یہودی بناتے ہیں یا عیسائی بناتے ہیں یا مجوسی بناتے ہیں۔

پس قرآن و حدیث صراحت کے ساتھ اسلام کو فطرت کا مذہب قرار دیتے ہیں۔ یعنی وہ مذہب جس پر فطرت انسانی اپنی اصل حالت میں شہادت دیتی ہے۔ اور یہاں پہلے اس مذہب فطرت کے اصل الاصول یعنی توحید الٰہی کا ذکر کیا یعنی یہ کہ اللہ کے ساتھ کسی شریک کا نہ ہونا ہر اس انسان پر ظاہر ہے جو فکر و عقل سے کام لیتا یا علم رکھتا یا سنتا ہے۔ اور آگے پھر توحید کا صاف الفاظ میں ذکر کر کے رکوع کے آخر میں مخلوق خدا کی خدمت کا ذکر کیا ہے جو اس فطری مذہب کا دوسرا اصول ہے۔ ﴿فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ﴾

﴿لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ﴾ سے یہ مراد ہے کہ وہ اصل فطرت بہر حال قائم رہتی ہے **اسے کوئی بدل نہیں سکتا**۔ چنانچہ اس کی شہادت بھی سب مذاہب میں ملتی ہے کہ باوجود طرح طرح کے مشرکانہ عقائد کے بنا لینے کے توحید کو بھی قائم رکھا ہے۔ عیسیٰ مسیح کو خدا بنا کر ایک عیسائی کی فطرت تبدیل نہیں ہوئی، پھر بھی اسے ایک خدا کو ماننا پڑا۔ گو اس کے لیے عقل انسانی کے خلاف تین کو ایک بھی کہنا پڑا۔ مگر فطرت کی روشنی بجھی نہیں، گو اس پر طرح طرح کے پردے ڈال دیئے گئے۔

لَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۳۱﴾

کرو اور نماز کو قائم کرو اور مشرکوں میں سے نہ ہو۔ (2592)

مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴿۳۲﴾

ان میں سے جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور فرقے فرقے بن گئے سب گروہ اس پر جو ان کے پاس ہے خوش ہو رہے ہیں۔ (2593)

وَ اِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُّنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَاۤ اَذَاقَهُمْ مِّنْهُ رَحْمَةً اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾

اور جب لوگوں کو دکھ پہنچتا ہے اپنے رب کو پکارتے ہیں، اس کی طرف رجوع کرتے ہوئے۔ پھر جب وہ انہیں اپنی طرف سے رحمت چکھاتا ہے تو ان میں سے ایک فریق اپنے رب کے ساتھ شریک بنانے لگتے ہیں۔

لِيَكْفُرُوْا بِمَاۤ اٰتَيْنٰهُمْ ؕ فَتَمَتَّعُوْا ۟ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۴﴾

تاکہ اس کی ناشکری کریں جو ہم نے انہیں دیا ہے۔ سو فائدہ اٹھالو پھر تم جلد جان لو گے۔

2592- یہاں توحید کے عملی پہلو کو بیان کیا یعنی صرف اللہ کو ایک مان لینا کافی نہیں بلکہ پھر اسی کی طرف رجوع بھی کرنا ضروری ہے اور اس کا تقویٰ کرنا یعنی اس کے قائم کردہ حقوق کو ملحوظ رکھنا اور نماز جو اس کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کا واحد ذریعہ ہے اسے قائم رکھنا ضروری ہے۔

2593- پچھلی آیت میں فرمایا تھا کہ مشرکوں میں سے نہ ہو۔ یہاں انہی کے متعلق فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور ان کا دین کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا یہ ہے کہ توحید الٰہی پر جو اصل الاصول تھا قائم نہ رہے بلکہ اس **توحید کے ساتھ شرک کو ملا لیا**۔ کسی نے کسی اور کسی نے کسی کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنایا۔ اگر دین کے اصل الاصول پر قائم رہتے تو باہم یہ تفرقہ بھی نہ ہوتا لیکن حالت یہ ہوگئی کہ توحید کو جو اصل تھا پیچھے چھوڑا اور جو اس کے ساتھ شرک ملایا تھا اسے ہی مذہب کی اصل بنیاد سمجھ لیا۔ ایک عیسائی سارا زور حضرت مسیح کی خدائی پر لگاتا ہے اور توحید کو تین ایک کہہ کر برائے نام رکھا ہوا ہے۔ ایک ہندو اپنے بتوں کو سب کچھ سمجھتا ہے، انہی سے دعا کرتا ہے، انہی کی عبادت کرتا ہے اور ایک اللہ کی ہستی برائے نام تسلیم کی ہوئی ہے۔

اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوْا بِهٖ يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۵﴾

یا ہم نے ان پر کوئی سند اتاری ہے جو ان کو (ان کا پتہ) بتاتی ہے جنہیں وہ اس کے ساتھ شریک کرتے ہیں۔ (2594)

وَ اِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوْا بِهَا ؕ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ اِذَا هُمْ يَقْنَطُوْنَ ﴿۳۶﴾

اور جب ہم لوگوں کو رحمت چکھاتے ہیں اس پر خوشی مناتے ہیں اور اگر انہیں اس کی وجہ سے جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے مصیبت پہنچتی ہے تو وہ مایوس ہو جاتے ہیں۔

اَوَ لَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۳۷﴾

کیا وہ غور نہیں کرتے کہ اللہ جس کے لیے چاہتا ہے رزق کو فراخ کرتا ہے اور (جس کے لیے چاہتا ہے) تنگ کرتا ہے۔ اس میں یقیناً ان لوگوں کے لیے نشان ہیں جو ایمان لاتے ہیں۔

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَ الْمِسْكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ۫ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۳۸﴾

سو قریبی کو اس کا حق دے اور مسکین کو اور مسافر کو (بھی)۔ یہ ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو اللہ (تعالیٰ) کی رضا چاہتے ہیں اور وہی کامیاب ہونے والے ہیں۔ (2595)

2594- ﴿يَتَكَلَّمُ﴾ دلیل کا کلام کرنا بطور مجاز ہے، مراد اس سے دلالت کرنا ہے۔ (ر) جیسا دوسری جگہ ہے ﴿هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ﴾ [الجاثية: 29:45] ''یہ ہماری کتاب تمہارے بارے میں حق کے ساتھ بولتی ہے۔'' مطلب یہ ہے کہ فطرت انسانی کی اس روشنی کو وہ کیوں قبول نہیں کرتے۔ کیا کوئی دلیل اللہ تعالیٰ نے ایسی اتاری ہے جس نے ان کے دلوں پر تسلط کر لیا ہے۔

2595- **ایک کے مال میں دوسروں کا حق:** ﴿حَقَّهٗ﴾ سے مراد گو بعض نے حق مان لیا ہے مگر ابن جریر نے اس کی تفسیر [حَقَّهُ عَلَيْكَ مِنَ الصِّلَةِ وَالْبِرِّ] سے کی ہے اور یہی صراحت الفاظ بھی چاہتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہر شخص کے مال میں اس کے قریبیوں کا (جو محتاج ہوں) اور مسافر یا مہمان کا اور عام مساکین کا بھی حق ہے اور ﴿اٰتِ﴾ کے حکم کی وجہ سے حضرت امام ابوحنیفہؒ نے ایسے نفقہ کو واجب قرار دیا ہے اور یہاں مراد زکوٰۃ مفروضہ نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ یہ سورت بالاتفاق مکی ہے۔ بلکہ مکہ میں بھی ابتدائی زمانہ کی ہے اور ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت کی کہ اس آیت کے نزول پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے باغِ فدک حضرت

وَ مَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَا۟ فِیْۤ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَ مَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ﴿۳۹﴾

اور جو تم سود پر دیتے ہو کہ لوگوں کے مال میں جا کر بڑھتا رہے، تو وہ اللہ کے ہاں نہیں بڑھتا۔ اور جو تم زکوٰۃ دیتے ہو (اس کے ساتھ) اللہ کی رضا چاہتے ہو تو یہی بڑھا لینے والے ہیں۔ (2596)

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یُحْیِیْكُمْ ؕ هَلْ مِنْ شُرَكَآىِٕكُمْ مَّنْ یَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَیْءٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ﴿۴۰﴾ ع 4 13 7

اللہ وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا، پھر تمہیں رزق دیا، پھر تمہیں مارے گا، پھر تمہیں زندہ کرے گا۔ کیا تمہارے شریکوں میں سے کوئی ہے جو اس میں سے کچھ بھی کرتا ہے۔ وہ پاک ہے اور اس سے بلند ہے جو وہ شرک کرتے ہیں۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بِمَا

خشکی اور تری میں فساد ظاہر ہو گیا، اس سے جو لوگوں کے

فاطمہ رضی اللہ عنہا کو دے دیا تھا کوئی اصلیت نہ ہونا اس سے ظاہر ہے کہ مکہ میں آنحضرت ﷺ خود باغِ فدک کے مالک نہ تھے۔

2596- ﴿رِّبًا﴾ [دیکھو نمبر: 351]۔ جو چیز انسان بطور تحفہ یا عطیہ دے یہ چاہتا ہوا کہ اسے اس سے زیادہ ملے تو اسے بھی ﴿رِبًا﴾ کہہ دیا جاتا ہے۔ (ل) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد وغیرہما سے یہاں ایسا ہی عطیہ یا تحفہ معنی مروی ہیں۔ (ج)

اصل مال پر زیادہ دینا یا لینا:

کسی عطیہ کا دینا یا مال کا لینا اس خواہش سے کہ اس سے بڑھ کر ملے جائز ہے۔ ہاں یہ لکھا ہے کہ یہ نبی کریم ﷺ پر حرام تھا۔ یعنی آپ اس خواہش سے کبھی کسی کو نہ دیتے تھے کہ زیادہ ملے اور اس کی وجہ آیت ﴿وَ لَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۝﴾ [المدثر: 6:74] ''اور اس لیے احسان نہ کر کہ زیادہ ملے۔'' دی ہے۔ اور اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ کسی شخص کا اصل مال پر جو دیا ہے زیادہ لے لینا حرام نہیں اور نہ یہ دینے والے پر گناہ ہے۔ (ر) اور یہاں مطلب صرف اس قدر ہے کہ جس نے اس خواہش سے عطیہ کسی کو دیا وہ کسی اجر کا مستحق نہیں، کیونکہ اس کی نیت اس ذریعہ سے کچھ مال کمانے کی ہے۔ ہاں اجر اس پر ملتا ہے جو بطور صدقہ محض اللہ تعالیٰ کی رضا کو مدنظر رکھ کر دیا جائے۔ اور اگر رِبًا کے معنی سود بھی کیے جائیں تو یہ آیت نہ اس کی حرمت پر دلیل ہے نہ فرضیت زکوٰۃ کی۔ بلکہ یہاں صرف دو باتوں کا مقابلہ ہے اور اصل میں تحریص زکوٰۃ کی دلائی ہے۔

كَسَبَتْ اَيْدِى النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِىْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۴۱﴾

ہاتھوں نے کمایا تا کہ انہیں اس کا کچھ مزہ چکھائے جو انہوں نے کیا۔شاید وہ رجوع کریں۔(2597)

قُلْ سِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلُ ؕ كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّشْرِكِيْنَ ﴿۴۲﴾

کہہ، زمین میں چلو پھرو، پھر دیکھو کہ ان کا جو پہلے تھے انجام کیسا ہوا۔ان میں سے اکثر مشرک تھے۔

2597- ﴿الْبَحْرِ﴾ [دیکھو نمبر: 73] اور بَحْرٌ کے معنی رِیْفٌ بھی ہیں یعنی ایسے مقامات جو پانی اور سبزی والے ہوں یا جو ساحل سمندر پر واقع ہوں۔اور [مُدُنَ الْبَحْرِ] یا سمندر کے شہر بھی اس کے معنی کیے گئے ہیں اور بَحْرَۃٌ زمین اور شہر کو کہتے ہیں اور عرب کے لوگ شہروں اور گاؤں کو بِحَارٌ کہتے ہیں اور حدیث میں ہے [كَتَبَ لَهُ بِبَحْرِهِمْ] (صحيح البخارى، كتاب الزكوٰة، باب خَرْصِ التَّمْرِ، حديث: 1481) جہاں معنی ہیں ان کے شہر میں اور ان کی زمین میں ان کے لیے لکھا۔(ل) اور قتادہ کا قول ہے کہ بَرٌّ سے مراد جنگل اور قبائل کے مواضع اور صحراؤں اور خیموں کے رہنے والے ہیں اور بَحْرٌ سے مراد شہر ہیں۔(ر)

خواہ بر اور بحر سے مراد خشکی اور تری لیں یا دیہات اور شہر۔ماحصل ایک ہے یعنی مراد اس سے **کل عالم میں فساد کا ظاہر ہونا ہے**۔ اور بعض نے جو بحر کے فساد سے مراد جہازوں، کشتیوں کا غصب یا فساد لیا ہے تو یہ بھی درست ہے۔یعنی سمندر کے فساد سے مراد وہ فساد بھی ہوسکتا ہے جس کا ارتکاب سمندروں پر حکومت کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور اَلْفَسَادُ سے مراد یہاں خشک سالی، موت، آگ لگنا وغیرہ مصائب بھی لیے گئے ہیں اور ابن آدم کا اپنے بھائی کو قتل کرنا بھی۔مگر ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں ان الفاظ کی عظمت کے شایاں نہیں۔قتادہ سے روایت ہے کہ یہ فساد قبل از بعثت نبوی تھا اور فساد سے مراد اس حالت میں شرک اور ہر ایک قسم کی بدی کا دور دورہ ہے اور تاریخ عالم اس پر شاہد ہے کہ تاریکی اور جہالت اور بدی نبی کریم ﷺ کے ظہور سے پہلے اپنے کمال کو پہنچ گئی تھی۔سر ولیم میور جیسے متعصب عیسائی کو یہ اقرار ہے کہ عیسائیت کی جو دنیا کا اس وقت کا آخری مذہب تھا اس وقت نہایت ذلیل حالت تھی۔چنانچہ اس کے یہ لفظ ہیں ''ساتویں صدی کی عیسائیت بہت ہی گری ہوئی اور فساد کی حالت میں تھی۔'' باقی مذاہب جن پر اس سے بھی زیادہ زمانہ گزر چکا تھا اسی سے قیاس ہوسکتا ہے۔ہندوستان میں اس وقت جہالت کا اس قدر زور تھا کہ بڑے بڑے نیک آدمیوں اور دیوتاؤں کی طرف بدترین سیاہ کاریوں کا ارتکاب منسوب کیا جاتا تھا۔غرض تمام ممالک روشنی سے خالی ہو چکے تھے اور اس فساد عظیم کی طرف یہاں اشارہ ہے۔اور اس صورت میں ﴿لِيُذِيْقَهُمْ﴾ میں لام عاقبت کا ہے اور روح المعانی میں ہے کہ اس آیت کا حکم ہر اس فساد کے لیے عام ہے جو قیامت تک ظاہر ہو۔اس صورت میں جو فسادات عظیم آج عالم میں بپا ہو رہے ہیں ان کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ الْقَيِّمِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ يَوْمَئِذٍ يَّصَّدَّعُوْنَ ﴿۴۳﴾

سو اپنی توجہ کو قائم کر دینے والے دین کے لیے سیدھا کر اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس کے لیے اللہ کی طرف سے ٹلنا نہیں، اس دن وہ الگ الگ ہو جائیں گے۔

مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ۚ وَ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ ﴿۴۴﴾

جو کفر کرتا ہے تو اس کا (وبال) کفر اسی پر ہے اور جو کوئی نیک عمل کرتا ہے تو وہ اپنی ہی جانوں کے لیے سامان کرتے ہیں۔

لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۵﴾

تا کہ وہ انہیں جو ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں اپنے فضل سے بدلہ دے۔ وہ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔

وَ مِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ يُّرْسِلَ الرِّيَاحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّ لِيُذِيْقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَ لِتَجْرِيَ الْفُلْكُ بِاَمْرِهٖ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۴۶﴾

اور اس کے نشانوں سے ہے کہ وہ ہواؤں کو خوش خبری دیتے ہوئے بھیجتا ہے اور تا کہ وہ تمہیں اپنی رحمت چکھائے اور تا کہ کشتیاں اس کے حکم سے چلیں اور تا کہ تم اس کے فضل کو طلب کرو اور تا کہ تم شکر کرو۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا ؕ وَ كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۷﴾

اور ہم نے تجھ سے پہلے رسولوں کو ان کی قوموں کی طرف بھیجا۔ پس وہ ان کے پاس کھلی دلائل لے کر آئے۔ سو ہم نے ان کو سزا دی جو مجرم ہوئے، اور مومنوں کی مدد کرنا ہم پر لازم ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ كَيْفَ يَشَآءُ وَ

اللہ وہ ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے سو وہ بادل کو اٹھاتی ہیں پھر وہ اسے جس طرح چاہتا ہے آسمان میں پھیلاتا ہے اور

يَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۴۸﴾

اسے تہ بتہ کر دیتا ہے، پھر تو مینہ کو دیکھتا ہے کہ اس کے اندر سے نکلتا ہے۔ سو جب وہ اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے اسے پہنچاتا ہے تو وہ خوش ہوتے ہیں۔

وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِيْنَ ﴿۴۹﴾

گو وہ اس سے پہلے جو ان پر اتارا جائے اس سے پہلے وہ بالکل مایوس تھے۔

فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۚ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۵۰﴾

سو اللہ کی رحمت کے آثار کی طرف دیکھ کس طرح زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتا ہے، بے شک وہی مردوں کو زندہ کرنے والا اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (2598)

وَ لَئِنْ اَرْسَلْنَا رِيْحًا فَرَاَوْهُ مُصْفَرًّا لَّظَلُّوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ يَكْفُرُوْنَ ﴿۵۱﴾

اور اگر ہم ہوا بھیجیں پھر وہ اسے زرد دیکھیں تو اس کے بعد بھی کفر ہی کرتے رہیں گے۔ (2599)

2598- رکوع کی ابتدا زمین میں فساد کے ہونے سے کی تھی اور بدکاروں کے انجام کی طرف توجہ دلائی تھی۔ پھر ہواؤں اور بارشوں کا ذکر کر کے نہایت لطیف پیرایہ میں یہاں آ کر اصل مطلب کو واضح کر دیا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی رحمت ظاہر دنیا میں کام کر کے مردہ زمین کو زندہ کر دیتی ہے اسی طرح اب یہ روحانی مردے زندہ ہوں گے۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ [آیت: 41] میں فساد سے مراد روحانی مردگی ہی تھی۔

2599- ﴿فَرَاَوْهُ﴾ رَاَوْهُ میں ضمیر نبات کی طرف لی گئی ہے جو سیاق کا مفہوم ہے یعنی کوئی ایسی ہوا چلے جو نبات کو زرد کر دے۔ مگر ایک قول ہے کہ ضمیر سَحَابٌ کے لیے ہے۔ یعنی بادل کو زرد دیکھیں گے کیونکہ زرد بادل پانی نہیں برساتا۔ اور ایک اور قول ہے کہ رِيْحٌ کو مذکر بھی لایا جاتا ہے اور مؤنث بھی۔ اور یہاں ضمیر رِيْحٌ کی طرف ہی ہے۔ (ر) اور میرے نزدیک یہ آخری قول ہی صحیح ہے اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے آثار تو یوں نمایاں ہیں لیکن ان کے انکار کی وجہ سے اگر عذاب کی ہوا بھی آئے تو بھی کفر سے باز نہ آئیں۔ اور زرد ہوا سے مراد یہاں عذاب کی ہوا ہی ہے اور یہ ان کے **کفر پر اصرار** کی حالت کا بیان ہے۔ جیسا کہ اگلی آیات میں واضح کر دیا ہے۔

فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَ لَا تُسْمِعُ الصُّمَّ
الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿٥٢﴾

پس تو مردوں کو نہیں سنا سکتا اور نہ بہروں کو آواز سنا سکتا ہے جب وہ پیٹھ پھیر کر واپس ہو جائیں۔

وَ مَآ اَنْتَ بِهٰدِ الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ؕ اِنْ
تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ
ع 5 13 8 مُّسْلِمُوْنَ ﴿٥٣﴾ ع

اور نہ تو اندھوں کو ان کی گمراہی سے (روک کر) ہدایت دے سکتا ہے۔تو صرف انہی کو سنا سکتا ہے جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں، سو وہ فرمانبردار ہیں۔(2600)

قرء حفص بضم الضاد و فتحها في الثلاثة لكن الضم مختار 12

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضَعْفٍ ثُمَّ
جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضَعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ
مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضَعْفًا وَّ شَيْبَةً ؕ يَخْلُقُ مَا
يَشَآءُ ۚ وَ هُوَ الْعَلِيْمُ الْقَدِيْرُ ﴿٥٤﴾

اللہ وہ ہے جس نے تمہیں کمزوری (کی حالت) سے بنایا، پھر کمزوری کے بعد قوت دی، پھر قوت کے بعد کمزوری اور بڑھاپا بنایا۔وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور وہ جاننے والا قدرت والا ہے۔(2601)

2600- ان دونوں آیتوں میں اسی ان کے اصرار کفر کا ہی ذکر ہے۔[دیکھو نمبر: 2491] نیز [دیکھو نمبر: 2719]۔

سماع موتیٰ:

یہاں ظاہر الفاظ کو لے کر سماع موتیٰ پر بھی بحث کی گئی ہے اور اس حدیث سے کہ بدر کے دن اہل قلیب کو پکار کر نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا: [قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا] (صحيح البخاري، كتاب المغازي، باب قَتْلِ أَبِي جَهْلٍ: 3976) اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سوال پر فرمایا کہ تم ان سے بہتر نہیں سنتے۔اس بات کا استدلال کیا گیا ہے کہ مردے سنتے ہیں۔حالانکہ ظاہر الفاظ کو لیں تو قرآن کریم صاف فرماتا ہے کہ مردے نہیں سنتے۔اور اصولاً بھی یہ بات قبول کرنے کے قابل نہیں کہ مر کر انسان کے حواس ایسے ہو جاتے ہیں کہ کہیں کوئی زندہ دنیا میں کچھ بات کرے تو مردہ اسے سن لیتا ہے۔بات صرف اس قدر ہے کہ خاص حالات میں اللہ تعالیٰ کے اذن سے ایک بات مردہ کو زندہ کی طرف سے پہنچا دی جاتی ہے اور یہی مطلب اہل قلیب والی حدیث کا ہے۔یعنی اس وقت وہ اس بات کو ایسا سن رہے ہیں جیسا تم سن رہے ہو۔قتادہ سے مروی ہے: [اَحْيَاهُمُ اللّٰهُ حَتّٰى اَسْمَعَهُمْ] (صحيح البخاري، كتاب المغازي، باب قَتْلِ أَبِي جَهْلٍ: 3976) اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ کر دیا یہاں تک کہ یہ بات ان کو سنا دی۔اسی طرح اہل القبور کو اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ کہنا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ انہیں پہنچا دیتا ہے۔

2601- ﴿ضُعْفٍ﴾ انسان کی ابتدائی حالت ایسی کمزوری کی ہے کہ اس پر خود لفظ ﴿ضُعْفٍ﴾ بولا ہے۔نطفہ کی حالت میں تو ایسا کمزور ہے

وَ یَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ یُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۙ مَا لَبِثُوْا غَیْرَ سَاعَةٍ ؕ كَذٰلِكَ كَانُوْا یُؤْفَكُوْنَ ﴿۵۵﴾

اور جب وہ گھڑی آئے گی مجرم قسمیں کھائیں گے (کہ) وہ ایک گھڑی سے زیادہ نہیں ٹھہرے، اسی طرح الٹے پھر جاتے تھے۔

وَ قَالَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَ الْاِیْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى یَوْمِ الْبَعْثِ ۚ فَهٰذَا یَوْمُ الْبَعْثِ وَ لٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۵۶﴾

اور وہ جنہیں علم اور ایمان دیا گیا ہے کہیں گے تم اللہ کے حکم کے مطابق جی اٹھنے کے دن تک ٹھہرے رہے۔ سو یہ جی اٹھنے کا دن ہے لیکن تم نہیں جانتے تھے۔

فَیَوْمَىٕذٍ لَّا یَنْفَعُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مَعْذِرَتُهُمْ وَ لَا هُمْ یُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۵۷﴾

پس اس دن انہیں جو ظالم تھے ان کا عذر کوئی نفع نہیں دے گا اور نہ انہیں ناراضگی دور کرنے کا موقع دیا جائے گا۔

وَ لَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ وَ لَىٕنْ جِئْتَهُمْ بِاٰیَةٍ لَّیَقُوْلَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ ﴿۵۸﴾

اور ہم نے لوگوں کے لیے اس قرآن میں ہر قسم کی مثالیں بیان کی ہیں اور اگر تو ان کے پاس نشان لائے تو جو کافر ہیں وہ کہہ دیں گے کہ تم صرف دھوکا دینے والے ہو۔ (2602)

كَذٰلِكَ یَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۵۹﴾

اسی طرح اللہ ان کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے جو نہیں جانتے۔

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ لَا یَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِیْنَ لَا یُوْقِنُوْنَ ﴿۶۰﴾ ع 6 7 9

سو صبر کر، اللہ کا وعدہ سچا ہے اور وہ لوگ تجھے خفیف نہ کریں جو یقین نہیں کرتے۔

کہ وہ نظر بھی نہیں آتا۔ پھر رحم میں، پھر بچہ ہونے کی حالت میں بھی کس قدر کمزور ہے۔ اس میں توجہ انسان کی دوسری زندگی کی طرف دلائی ہے اور ساتھ ہی بتایا کہ عرب بھی قوت پکڑیں گے گو اس قوت کے بعد پھر ایک دفعہ کمزوری ہے۔

2602 - ﴿مُبْطِلُوْنَ﴾ سے مراد یہاں مُزَوِّرُوْنَ یا فریب دینے والے یعنی فریب دے کر حق کو باطل کرنے والے ہیں۔

سورۃ لقمان

نام:

اس سورت کا نام لقمان ہے اور اس میں 4 رکوع اور 34 آیتیں ہیں۔اس سورت کے دوسرے رکوع میں حضرت لقمان علیہ السلام کا ذکر ہے جو حبش کے رہنے والے تھے اور بتانا یہ مقصود ہے کہ اعلیٰ درجہ کی اخلاقی تعلیم جس سے قوموں کو فلاح ملتی ہے کسی ایک قوم سے خاص نہیں بلکہ ہر ملک اور ہر قوم میں وہ تعلیم اللہ نے اپنی خاص وحی سے پہنچائی۔

خلاصہ مضمون:

① پہلے رکوع میں یہ ذکر ہے کہ مومن جو اللہ تعالیٰ کے آگے جھکتے ہیں اور مخلوق خدا کی ہمدردی میں اپنے قویٰ اور اپنے اموال کو صرف کرتے ہیں کامیاب ہوں گے۔

② دوسرے رکوع میں حضرت لقمان علیہ السلام کی نصائح اپنے بیٹے کو ہیں جن کی غرض یہی بتانا ہے کہ فلاح اخلاق فاضلہ سے ملتی ہے اور ان اخلاق فاضلہ کی تعلیم یہاں لقمان کے منہ سے دلا کر بتایا ہے کہ اصلاح اخلاق اللہ تعالیٰ کی ایسی نعمت ہے جو تمام دنیا کو پہنچائی گئی۔

③ تیسرے رکوع میں اللہ تعالیٰ کے نعمائے ظاہری و باطنی کا ذکر ہے اور اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کی مخلوق کی وسعت کی طرف توجہ دلائی ہے۔

④ چوتھے رکوع میں بتایا ہے کہ نعمائے الٰہی کا انکار کرنے والے آخر پکڑے جاتے ہیں۔

تعلق:

پچھلی سورت میں مسلمانوں کے غلبہ کی کھلی پیشگوئی کی تھی۔ یہاں بتایا ہے کہ فلاح یا کامیابی کی بنیاد اخلاق فاضلہ ہیں۔

اٰیَاتُھَا 34 (31) سُوْرَۃُ لُقْمٰنَ مَکِّیَّۃٌ (57) رُکُوْعَاتُھَا 4

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ	اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے
الٓمّٓ ۚ ﴿1﴾	میں اللہ کامل علم رکھنے والا ہوں۔
تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۙ ﴿2﴾	یہ حکمت والی کتاب کی آیتیں ہیں۔
هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ ۙ ﴿3﴾	احسان کرنے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔
الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ؕ ﴿4﴾	جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور آخرت پر وہ یقین رکھتے ہیں۔
اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿5﴾	وہی اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور وہی کامیاب ہونے والے ہیں۔
وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ وَّ يَتَّخِذَهَا هُزُوًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿6﴾	اور ایسے لوگ بھی ہیں جو کھیل کی باتوں کے خریدار ہیں تاکہ علم کے بغیر اللہ کی راہ سے گمراہ کریں، اور اسے ہنسی بنائیں۔ انہی کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔(2603)

2603- ﴿يَّشْتَرِيْ﴾ اِشْتِرَاءٌ ہر معاملہ پر بولا جاتا ہے جس سے کچھ حاصل ہو [نمبر: 29]۔ اور یہاں مراد اختیار کرنا ہے۔ (ج)

﴿لَهْوَ الْحَدِيْثِ﴾ سے مراد ہر وہ بات ہے جو اصل مقصد سے توجہ کو ہٹاتی ہے [نمبر: 932]۔ حسن کہتے ہیں ہر چیز جو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کے ذکر سے روکے جیسے کہانیاں، مخول بازی، خرافات، غنا۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما اور سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے نزدیک غناء یا اس قسم کی چیزیں مراد ہیں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ نضر بن الحرث نے ایک گانے بجانے والی لونڈی رکھی ہوئی تھی اور جس شخص کی نسبت اسے معلوم ہوتا کہ اسلام کی طرف مائل ہے اسے اس کے پاس لے جاتا کہ اسے گانے بجانے میں مشغول رکھو۔ اور بعض روایات میں ہے کہ وہ ایران سے کہانیاں سن کر آتا اور مجلس قریش میں انہیں سنا کر کہتا کہ محمد

وَ اِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِ اٰیٰتُنَا وَلّٰی مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ یَسْمَعْهَا كَاَنَّ فِیْۤ اُذُنَیْهِ وَقْرًا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝۷

اور جب اس پر ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں، تکبر کرتا ہوا پھر جاتا ہے گویا کہ انہیں سنا ہی نہیں۔ گویا اس کے کانوں میں بوجھ ہے۔ سو اسے دردناک عذاب کی خبر دے دے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتُ النَّعِیْمِ ۝۸ۙ

جو ایمان لاتے ہیں اور اچھے عمل کرتے ہیں، ان کے لیے نعمتوں والے باغ ہیں۔

خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝۹

انہیں میں رہیں گے اللہ کا وعدہ ہے سچا (وعدہ) اور وہ غالب حکمت والا ہے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَ اَلْقٰی فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِكُمْ وَ بَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ؕ وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِیْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِیْمٍ ۝۱۰

اس نے آسمانوں کو بغیر ایسے ستونوں کے پیدا کیا جنہیں تم دیکھ سکو اور زمین میں پہاڑ قائم کیے تاکہ وہ تمہیں لے کر کانپے نہیں۔ اور اس میں ہر قسم کے جانور پھیلائے اور ہم بادل سے پانی اتارتے ہیں پھر اس میں ہر قسم کی اعلیٰ درجہ کی چیزیں اگاتے ہیں۔

ﷺ تمہیں عاد و ثمود کی کہانیاں سناتے ہیں میں رستم و اسفندیار کی کہانیاں سناتا ہوں۔ (ر) اگر یہ کام اس زمانہ میں کفار کا تھا تو اس وقت مسلمانوں نے اختیار کیا ہوا ہے۔ کتنے مسلمان ہیں جن کی مجلسوں میں ہنسی ٹھٹھے میں گھنٹوں گزر جاتے ہیں مگر خدا کا نام تک نہیں لیا جاتا، نماز کے لیے وقت نہیں ملتا، قرآن کھول کر نہیں دیکھتے۔ آج جن لوگوں کے ہاتھ میں مسلمانوں کی باگ ہیں جو لیڈر کہلاتے ہیں ان کے سامنے نماز ہو رہی ہو تو ان کی ہنسی ٹھٹھے اور قہقہوں کی آواز میں ذرہ بھر فرق نہیں آتا۔ اس میں شامل ہونا تو ایک طرف رہا۔

غنا کے متعلق بہت بحث ہوئی ہے امام ابوحنیفہؒ سے اس کی حرمت مروی ہے۔ لیکن کسی شخص کا اکیلے رفع وحشت کے لیے گانا یا عیدوں یا شادیوں میں گانے کے متعلق اختلاف ہوا ہے اور امام مالکؒ سے بھی مروی ہے کہ انہوں نے غنا اور اس کے سننے سے منع کیا۔ امام شافعیؒ سے بھی منقول ہے کہ غنا لہو مکروہ ہے۔ لیکن اس سے اس قسم کا گانا مستثنیٰ ہے جیسے عورتوں کا بچوں کو لوری دینا یا

هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِیْ مَا ذَا خَلَقَ الَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۱۱﴾ ع 1 11 10

یہ اللہ کی پیدائش ہے، تو مجھے دکھاؤ کہ انہوں نے کیا پیدا کیا ہے جو اس کے سوائے ہیں۔ بلکہ ظالم کھلی گمراہی میں ہیں۔

وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ وَ مَنْ یَّشْكُرْ فَاِنَّمَا یَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ ﴿۱۲﴾

اور ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی کہ اللہ کا شکر کرے، اور جو کوئی شکر کرتا ہے وہ اپنی جان کی بھلائی کے لیے شکر کرتا ہے اور جو ناشکری کرتا ہے تو اللہ بے نیاز تعریف کیا گیا ہے۔ (2604)

وَ اِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَ هُوَ یَعِظُهٗ یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۳﴾ وقف النبی ﷺ

اور جب لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا اور وہ اسے نصیحت کرتا تھا اے میرے بیٹے اللہ کے ساتھ شریک نہ کرنا کہ شرک یقیناً بڑا بھاری ظلم ہے۔

اعراب کا حدی اونٹوں کو چلانے کے لیے یا جنگ میں۔ کیونکہ اس میں ایک مقصد مدنظر ہے۔ بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی ﷺ آپ پر داخل ہوئے اور آپ کے پاس دو لونڈیاں بعاث کے گیت گا رہی تھیں تو آپ منہ پھیر کر لیٹ گئے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آئے تو انہوں نے فرمایا کہ شیطان کی مزار رسول اللہ کے گھر میں۔ اور دوسری روایت میں ہے کہ یہ عید کا دن تھا اور آپ نے فرمایا اے ابوبکر ان کو چھوڑ دے۔ ہر قوم کے لیے عید کا دن ہوتا ہے۔ تو اس سے سرود کے جائز موقعوں پر جیسے یوم عید یا شادی میں دف کے جواز کی طرح غنا کا جواز نکالا جا سکتا ہے اور ایسے غنا کی حرمت میں تو کوئی شبہ ہی نہیں جس میں فحش ہو یا شراب وغیرہ کی تعریف۔ اور جو بعض مسلمانوں میں قوالی کا طریق مروج ہے اسے بھی اسی میں رکھا ہے۔ کیونکہ اس میں مجنونوں کے سے افعال ہوتے ہیں۔ جیسے ناچنا اور اچھلنا۔ اور روح المعانی میں ہے کہ یہ زندیقوں کے آثار میں سے ہے۔ بلکہ یہ بھی کہ ایسا سماع ممنوع ہے گو اس میں رقص نہ ہو۔

2604 - ﴿لُقْمٰنَ﴾ بظاہر یہ عجمی نام ہے گو اہل لغت نے اس کا اشتقاق لقم سے صحیح تسلیم کیا ہے اور گو بعض لوگوں نے اس میں اختلاف کیا ہے کہ لقمان کون تھے۔ مگر ترجیح اس قول کو ہے جو مجاہد، ابن عباس رضی اللہ عنہما، سعید ابن المسیب وغیرھم سے مروی ہے کہ یہ حبشی تھی اور نوبیہ یا مصر کے رہنے والے تھے۔ (ج) پھر اس بارہ میں اختلاف ہوا ہے کہ وہ نبی تھے یا انہیں صرف علم و حکمت عطا ہوا تھا۔ میرے نزدیک یہ قول صحیح نہیں کہ وہ نبی نہ تھے۔ کیونکہ قرآن کریم کے بیان کی غرض یہی ہے کہ وحی الٰہی اصل سرچشمہ اس علم و

وَ وَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰی وَهْنٍ وَّ فِصٰلُهٗ فِیْ عَامَیْنِ اَنِ اشْكُرْ لِیْ وَ لِوَالِدَیْكَ ؕ اِلَیَّ الْمَصِیْرُ ﴿۱۴﴾

اور ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ کے حق میں تاکیدی حکم دیا ہے اس کی ماں ضعف پر ضعف کی حالت میں اسے اٹھاتی ہے اور اس کا دودھ چھڑانا دو سال میں ہوتا ہے کہ میرا شکر کر اور اپنے ماں باپ کا بھی۔ میری طرف انجام کار آنا ہے۔

وَ اِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰۤی اَنْ تُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا وَ صَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا ۪ وَّ اتَّبِعْ سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ ۚ ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵﴾

اور اگر وہ تجھ پر زور دیں کہ تو میرے ساتھ اسے شریک کرے جس کا تجھے علم نہیں تو ان کی بات نہ مان اور دنیا میں ان کا اچھی طرح ساتھ دے اور اس کے رستہ کی پیروی کر جو میری طرف رجوع کرتا ہے۔ پھر میری طرف تمہارا لوٹ کر آنا ہے، سو میں تمہیں بتاؤں گا جو تم عمل کرتے تھے۔

یٰبُنَیَّ اِنَّهَاۤ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِیْ صَخْرَةٍ اَوْ فِی السَّمٰوٰتِ اَوْ فِی الْاَرْضِ یَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِیْفٌ خَبِیْرٌ ﴿۱۶﴾

اے میرے بیٹے! اگر وہ (عمل) رائی کے دانہ کے برابر بھی ہو پھر وہ کسی پتھر کے اندر ہو یا آسمانوں میں ہو یا زمین میں اللہ اسے لائے گا۔ اللہ باریکیوں سے واقف خبردار ہے۔ (2605)

حکمت کا ہے جو اخلاق سے تعلق رکھتے ہیں اور بالخصوص شرک کے خلاف زور دینے والی ایک ہی قوم ہوئی ہے یعنی انبیاء علیہم السلام۔ اور اَنْ قول کی تفسیر ہے اور اللہ تعالیٰ کا اس طرح احکام دینا انبیاء سے ہی خاص ہے۔ اور یہاں یہ بتایا ہے کہ شکر گزاری سے انسان خود فائدہ اٹھاتا ہے اور ناشکری سے اللہ تعالیٰ کا کچھ نہیں بگڑتا، اسے ضرورت نہیں کہ کوئی اس کا شکر گزار ہو۔

2605- ﴿اِنَّهَا﴾ میں ضمیر ﴿مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ سے جو عمل مفہوم ہوتا ہے اس کی طرف جاتی ہے اور ﴿صَخْرَةٍ﴾ یا پتھر میں ہونا اس لحاظ سے ہے کہ اس میں صلابت یعنی سختی ہے۔ اور آسمان میں ہونا بلندی کے لحاظ سے ہے اور زمین میں ہونا **تاریکی کے لحاظ سے** ہے۔

يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَ اْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ انْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ اصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۷﴾

اے میرے بیٹے! نماز کو قائم کر اور نیکی کا حکم دے، اور برائی سے روک اور جو تکلیف تجھے پہنچے اس پر صبر کر یہ ہمت کے کاموں میں سے ہے۔

وَ لَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَ لَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ﴿۱۸﴾

اور لوگوں سے بے رخی نہ کر اور نہ زمین میں اکڑتا ہوا چل۔ اللہ کسی خود پسند شیخی خورہ کو پسند نہیں کرتا۔ (2606)

وَ اقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَ اغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ؕ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ﴿۱۹﴾ ع

اور اپنی چال میں میانہ روی اختیار کر اور اپنی آواز کو نیچا رکھ یقیناً سب آوازوں سے بری آواز گدھے کی آواز ہے۔ (2607)

2606- ﴿تُصَعِّرْ﴾ صَعَرٌ منہ کا ایک طرف جھکانا ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ رخسار کے ایک طرف جھکانے سے مخصوص ہے۔ اور بعض کے نزدیک گردن کے میلان پر بولا جاتا ہے۔ اور صَعَرٌ کے معنی تکبر کے بھی ہیں اور متکبر کو کہا جاتا ہے [فِيْهِ صَعَرٌ] اور حدیث میں صَعَّارٌ بمعنی متکبر ہے اور ﴿لَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ﴾ کے معنی ہیں تکبر سے اعراض نہ کر۔ (ل)

﴿خَدَّكَ﴾ خَدٌّ رخسار کو کہتے ہیں۔ اور خَدٌّ اور اُخْدُوْدٍ زمین میں ایسے شق کو بھی کہتے ہیں جو مستطیل اور گہرا ہو ﴿قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۙ﴾ [البروج: 4:85] ''خندق والے ہلاک ہو گئے۔'' (غ)

2607- چلنے میں قصد یا میانہ روی سے یہ مراد نہیں کہ انسان اچھے تیز قدم سے نہ چلے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت میں ہے کہ آپ نے ایک شخص کو دیکھا کہ لاغری سے موت کے قریب پہنچا ہوا تھا۔ آپ نے پوچھا اسے کیا ہوا ہے۔ لوگوں نے کہا یہ قاریوں میں سے ہے۔ آپ نے فرمایا عمر رضی اللہ عنہ سید القراء تھے۔ اور جب چلتے تھے تیز چلتے تھے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت میں ہے کہ جب آپ چلتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اوپر سے نیچے کی طرف آ رہے ہیں، یعنی تیز چلتے تھے۔ اور مجاہد نے [قَصَدَ فِي الْمَشْيِ] سے مراد متواضعانہ چال لی ہے۔ (ر)

نبوت کی نعمت عامہ:

عیسائیت کو مسیح کی تعلیم پر فخر ہے۔ لیکن قرآن کریم نے ایک حبشی نبی کے ذکر میں ان اعلیٰ درجہ کے اصول کو بیان کر کے جو مسیح کی تعلیم کا نچوڑ بلکہ اس سے کچھ بڑھ کر ہیں یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی قوم سے بخل نہیں کیا، بلکہ سب قوموں کو اعلیٰ درجہ کی اخلاقی

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ وَ اَسْبَغَ عَلَیْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّ بَاطِنَةً ؕ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یُّجَادِلُ فِی اللّٰهِ بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّ لَا هُدًی وَّ لَا كِتٰبٍ مُّنِیْرٍ ﴿۲۰﴾

کیا تم غور نہیں کرتے کہ اللہ نے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے تمہارے کام میں لگا رکھا ہے اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتوں کو پورا کیا ہے اور لوگوں میں سے وہ بھی ہے جو اللہ کے بارے میں جھگڑتا ہے (حالانکہ) نہ ان کے پاس علم ہے اور نہ ہدایت اور نہ روشن کرنے والی کتاب۔ (2608)

وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَ لَوْ كَانَ الشَّیْطٰنُ یَدْعُوْهُمْ اِلٰی عَذَابِ السَّعِیْرِ ﴿۲۱﴾

اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ اس کی پیروی کرو جو اللہ نے اتارا ہے کہتے ہیں بلکہ ہم اس کی پیروی کرتے ہیں جس پر ہم نے باپ دادوں کو پایا اور کیا اگرچہ شیطان انہیں جلتی ہوئی آگ کے عذاب کی طرف بلا رہا ہو۔ (2609)

تعلیم عطا فرمائی اور جس بات پر یورپ کے سفید منہ والوں کو فخر ہے وہی تعلیم حبش کے ایک سیاہ فام کو بھی اللہ تعالیٰ نے دی۔ پس اختلاف الوان اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

2608- ﴿اَسْبَغَ﴾ [شَیْءٌ سَابِقٌ] کامل پوری چیز کو کہتے ہیں۔ اور اَسْبَغَ کے معنی اَوْسَعَ ہیں وسیع کیا۔ اور [اَسْبَغَ اللّٰهُ عَلَیْهِ النِّعْمَةَ] کے معنی ہیں اس پر نعمت کو کامل کیا اور تمام کو پہنچایا اور وسیع کیا۔ (ل)

ظاہری نعمتیں وہ ہیں جو انسان کی جسمانی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں اور باطنی وہ ہیں جو اخلاق اور روحانیت سے تعلق رکھتی ہیں اور ظاہری نعمتوں کا ذکر صراحت سے ﴿سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ﴾ میں کر کے توجہ دلائی ہے کہ باطنی نعمتوں کی تکمیل بھی بغیر اس کے نہیں ہو سکتی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا سامان ہو اور اسی سامان کا ذکر آگے ہدایت اور کتاب منیر میں ہے۔

2609- یعنی ان باتوں میں بھی باپ دادا کا اتباع نہیں چھوڑتے جن کا کھلا نتیجہ دکھ اور تکلیف ہے۔ کتاب منیر کے ذکر کے بعد اس مضمون کے لانے سے یہ منشا ہے کہ نعمائے باطنی میں لوگ دلائل کی پیروی نہیں کرتے۔ جن کی طرف اللہ تعالیٰ کی وحی توجہ دلاتی ہے۔ بلکہ اندھا دھند تقلید میں لگے چلتے ہیں۔

وَ مَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗۤ اِلَى اللّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝٢٢

اور جوشخص اپنے تئیں اللہ کی فرمانبرداری میں لگا دیتا ہے اور وہ احسان کرنے والا ہے۔ تو اس نے ایک محکم جائے گرفت کو مضبوط پکڑ لیا اور (سب) کاموں کا انجام اللہ کے اختیار میں ہے۔

وَ مَنْ كَفَرَ فَلَا يَحْزُنْكَ كُفْرُهٗ ؕ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ فَنُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝٢٣

اور جو کوئی کفر کرتا ہے تو اس کا کفر تجھے غمگین نہ کرے، ہماری طرف انہیں لوٹ کر آنا ہے۔ سو ہم انہیں بتائیں گے جو انہوں نے کیا۔ اللہ سینوں کی باتوں کو جاننے والا ہے۔

نُمَتِّعُهُمْ قَلِيْلًا ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ اِلٰى عَذَابٍ غَلِيْظٍ ۝٢٤

ہم انہیں تھوڑا سامان دیں گے پھر ہم انہیں سخت عذاب کی طرف کھینچ لے جائیں گے۔

وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝٢٥

اور اگر تو ان سے پوچھے کہ کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا؟ تو کہیں گے اللہ نے۔ کہہ، سب تعریف اللہ کے لیے ہے بلکہ ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝٢٦

اللہ کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، اللہ بے نیاز تعریف کیا گیا ہے۔

وَ لَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّ الْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝٢٧

اور اگر جو درخت زمین میں ہیں سب قلمیں بن جائیں اور سمندر سیاہی ہو۔ اس کے بعد سات سمندر اور ہوں تو اللہ کی باتیں ختم نہ ہوں۔ اللہ (تعالیٰ) غالب حکمت والا ہے۔(2610)

2610- اس آیت کا مضمون [الکھف: 109:18] کے مضمون سے مشابہ ہے اور بتایا یہ ہے کہ اللہ کے کلمات یا اس کی مخلوق وہی نہیں جو تم

مَا خَلْقُكُمْ وَ لَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ﴿۲۸﴾

تمہارا پیدا کرنا اور تمہارا دوبارہ اٹھانا ایک ہی جان کی طرح ہے۔ اللہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ۙ كُلٌّ يَّجْرِيْۤ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّ اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۹﴾

کیا تو غور نہیں کرتا کہ اللہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور اس نے سورج اور چاند کو کام پر لگا رکھا ہے۔ ہر ایک مقرر وقت تک چلتا ہے اور جو تم کرتے ہو اللہ اس سے خبردار ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَ اَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبَاطِلُ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿۳۰﴾ ع 3 11 12

یہ اس لیے کہ اللہ ہی حق ہے اور کہ جس کو اس کے سوائے پکارتے ہیں وہ باطل ہے اور کہ اللہ بہت بلند بہت بڑا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ لِيُرِيَكُمْ مِّنْ اٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿۳۱﴾

کیا تو غور نہیں کرتا کہ کشتیاں سمندر میں اللہ کی نعمت لے کر چلتی ہیں تاکہ وہ تمہیں اپنے نشانوں سے دکھائے۔ اس میں یقیناً ہر ایک صبر کرنے والے شکر کرنے والے کے لیے نشان ہیں۔ (2611)

دیکھتے ہو بلکہ اسے اتنی وسعت حاصل ہے کہ کل زمین کے درختوں کی اگر قلمیں بنادی جائیں اور سمندر سیاہی بن جائیں بلکہ ایسے ہی اور بھی بے شمار سمندر (سَبْعَةُ کا استعمال عدد کامل کے طور پر ہے [دیکھو نمبر: 44]) سیاہی بن جائیں تو وہ مخلوق احاطہ شمار میں نہیں آسکتی۔ اور اس میں توجہ اللہ تعالیٰ کی کمال عظمت کی طرف دلائی ہے۔

2611- ﴿نِعْمَةٌ﴾ سے مراد یہاں احسان ہے اور مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ایسے اسباب پیدا کیے ہیں جن سے کشتیاں چلتی ہیں اور یا مراد یہ ہے کہ کشتیاں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو لیے ہوئے چلتی ہیں۔ اور نشانوں کا صبر کرنے والوں اور شکر کرنے والوں کے لیے ہونا اس لحاظ سے ہے کہ ان ذرائع سے نعمتوں کو وہی حاصل کر سکتے ہیں جو مصائب کو برداشت کرتے ہیں اور پھر وہ نعمتیں انہیں کے پاس رہتی ہیں جو ان پر شکر کرتے ہیں۔ اور یا اشارہ اس طرف ہے کہ ایک قوم جو اس وقت صبر سے کام لے رہی ہے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر کرتی ہے، اسے ایک دن سمندروں کا مالک بنا دیا جائے گا۔

وَ اِذَا غَشِیَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ؕ وَ مَا یَجْحَدُ بِاٰیٰتِنَاۤ اِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوْرٍ ﴿۳۲﴾

اور جب انہیں لہر سائبانوں کی طرح ڈھانک لیتی ہے اللہ کو اسی کی بندگی کو خالص کرتے ہوئے پکارتے ہیں۔ پھر جب انہیں خشکی پر بچالاتا ہے تو ان میں سے بعض میانہ روی اختیار کرنے والے ہوتے ہیں اور ہماری آیتوں کا سوائے ہر دغاباز ناشکرگزار کے اور کوئی انکار نہیں کرتا۔ (2612)

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَ اخْشَوْا یَوْمًا لَّا یَجْزِیْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ ۫ وَ لَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَیْـًٔا ؕ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا ۪ وَ لَا یَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ﴿۳۳﴾

اے لوگو! اپنے رب کا تقویٰ کرو اور اس دن سے ڈرو جس دن باپ اپنے بیٹے کے کچھ کام نہیں آئے گا اور نہ بیٹا اپنے باپ کے کچھ کام آسکے گا۔ اللہ کا وعدہ سچا ہے، سو دنیا کی زندگی تمہیں دھوکا نہ دے اور نہ بڑا دھوکا دینے والا اللہ کے بارے میں تمہیں کچھ دھوکا دے۔ (2613)

اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَ یُنَزِّلُ الْغَیْثَ ۚ وَ یَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ ؕ وَ مَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّا ذَا تَكْسِبُ غَدًا ؕ وَ مَا

اللہ وہ ہے کہ اسی کے پاس قیامت کا علم ہے۔ اور وہ مینہ برساتا ہے اور جو کچھ رحموں میں ہے اسے جانتا ہے اور کوئی شخص نہیں جانتا کل کیا کرے گا اور کوئی

2612- ﴿خَتَّارٍ﴾ خَتْرٌ ایسا غدر جس میں زور لگانے کی وجہ سے انسان کمزور ہوجائے۔ (غ) یا فریب دہی یا بہت بری قسم کی غداری۔ (ل) بعض کی میانہ روی اور بعض کی بدعہدی کے ذکر میں یہ اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان بھی جب ان نعمتوں کی جو انہیں دی جائیں ناشکری کریں گے تو اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آجائیں گے۔

2613- ﴿الْغَرُوْرُ﴾ غَرُوْرٌ۔ غَرَرْتُ کے لیے [دیکھو نمبر: 582] اور غَرُوْرٌ ہر وہ چیز ہے جو انسان کو دھوکا دے مال، مرتبہ، شہوت، شیطان۔ اور شیطان سے اس کی تفسیر کی گئی ہے۔ اس لیے کہ وہ خبیث ترین دھوکہ دینے والا ہے۔ (غ) اَلنَّاسُ میں سب لوگ شامل ہیں۔ غیر مسلم ہوں یا مسلم۔

تَدْرِیْ نَفْسٌۢ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ ﴿۳۴﴾ ع 4 4 13

شخص نہیں جانتا کہ کس زمین میں مرے گا۔اللہ (تعالیٰ) جاننے والا خبردار ہے۔(2614)

2614- **پانچ باتوں کا علم کسی کو نہیں:** بخاری میں ایک لمبی حدیث میں جس میں ایمان اور اسلام اور احسان کے متعلق سوال ہے۔ یہ بھی ہے کہ آخر پر اس شخص نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا[مَتَى السَّاعَةُ] یعنی وہ گھڑی یا قیامت کب ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کے متعلق مسئول کا علم سائل سے زیادہ نہیں۔ اور پھر آپ ﷺ نے فرمایا یہ ان پانچ باتوں میں سے ایک ہے جنہیں سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا، اور پھر یہ آیت پڑھی۔ اور بخاری میں ہی ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا غیب کے خزانے پانچ ہیں۔ تب یہ آیت پڑھی۔ اور بعض روایات میں ہے کہ ان پانچ باتوں کا علم نبی ﷺ کو نہیں دیا گیا۔ یہ تو صحیح ہے لیکن یہ سوال ہوتا ہے کہ ان پانچ باتوں کو اکٹھا لانے کی کیا وجہ ہے؟ کیونکہ غیب کی اور بھی بے شمار باتیں ہیں جن کا علم آنحضرت ﷺ کو دیا گیا نہ اور کسی کو دیا جاتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک رنگ میں یہ پانچوں باتیں حق کی کامیابی اور مخالفت کی ناکامی سے تعلق رکھتی ہیں۔ ﴿السَّاعَةِ﴾ سے مراد ساعت وسطیٰ لے کر مخالفین حق کی تباہی کا وقت مراد ہوسکتا ہے۔ بارش کے نازل کرنے میں عرب کی مردہ زمین کے زندہ کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ جیسا کہ بار بار بارش کا ذکر کر کے یہ بتایا بھی گیا ہے کہ جس طرح مردہ زمین کو زندہ کیا جاتا ہے اسی طرح تمہیں زندہ کیا جائے گا۔ ''ارحام میں جو ہیں'' وہ آئندہ نسل ہے جنہیں اللہ تعالیٰ جانتا ہے یعنی انہی کفار کی اولاد کے مسلمان ہوجانے کی طرف اشارہ ہے۔ اور ''کل کیا کرے گا'' میں یہ اشارہ ہے کہ جو آج حق کی مخالفت کر رہے ہیں وہی کل کو اس کے حامی بن جائیں گے۔ اور ''کس زمین میں مرے گا'' یہ اشارہ ہے کہ یہ لوگ پیغام حق کو لے کر کہیں کے کہیں نکل جائیں گے۔ اس میں ایک اور لطیف اشارہ بھی ہوسکتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے جب قیامت کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے یہ جواب دیا کہ اس کا علم کسی کو نہیں دیا گیا۔ حتیٰ کہ بیٹے کو بھی نہیں [دیکھو نمبر: 373]۔ پس معلوم ہوا بیٹا بھی انسانوں میں سے ایک انسان ہے نہ خدا۔

سورۃ السجدہ

نام:

اس سورت کا نام السَّجْدَۃ ہے اور اس میں 3 رکوع اور 30 آیات ہیں۔ اس نام میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مسلمانوں کی فلاح اور کامیابی قرآن کریم کی کامل فرمانبرداری سے وابستہ ہے اور یہی اس سورت کا مضمون ہے۔

خلاصہ مضمون:

① پہلے رکوع میں بتایا ہے کہ اسلام جو دنیا کی ہدایت کے لیے نازل ہوا ہے اس کے استحکام کے بعد اس پر ایک ہزار سال کا زمانہ ایسا آئے گا جس میں اس کی ترقی میں روک پیدا ہو جائے گی۔

② دوسرے رکوع میں مومن اور کافر کا مقابلہ کر کے بتایا کہ ایمان اسی بات کا نام ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی فوراً فرمانبرداری کی جائے اور

③ تیسرے میں مومنوں اور کافروں کے درمیان فیصلہ کا ذکر ہے۔

تعلق اور زمانۂ نزول:

یہ الٓمّٓ کے مکی مجموعہ کی آخری سورت ہے اور اس میں اسلام کے غلبہ اور استحکام کے ذکر کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ ایک وقت اس کی ترقی میں رکاوٹ کا بھی ہوگا مگر وہ ایک محدود زمانہ ہے۔ اس میں گویا اس کی آخری کامیابی کی بشارت بھی ہے اور یہ بھی مکی سورت ہے اور اسی زمانہ کی ہے جس زمانہ کی اس مجموعہ کی باقی سورتیں ہیں۔

اٰيَاتُهَا 30 (32) سُوْرَةُ السَّجْدَةِ مَكِّيَّةٌ (75) رُكُوْعَاتُهَا 3

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

الٓمّٓ ۚ ﴿1﴾

میں اللہ کامل علم رکھنے والا ہوں۔

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ؕ ﴿2﴾

اس کتاب کا اتارنا اس میں کچھ شک نہیں جہانوں کے رب کی طرف سے ہے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۚ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿3﴾

کیا یہ کہتے ہیں اس نے خود اسے بنالیا ہے بلکہ وہ تیرے رب کی طرف سے حق ہے تاکہ تو اس قوم کو ڈرائے جن کے پاس تجھ سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تاکہ وہ ہدایت پائیں۔(2615)

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ؕ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا شَفِيْعٍ ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴿4﴾

اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے چھ وقتوں میں پیدا کیا پھر وہ عرش پر غالب ہے۔ اس کے سوائے تمہارا کوئی کارساز نہیں اور نہ کوئی شفاعت کرنے والا ہے۔ تو کیا تم نصیحت نہیں پکڑتے؟

2615- [دیکھو القصص: 46] بنی اسماعیل میں کوئی نبی نہیں آیا اور یہاں نذیر سے مراد منجانب اللہ ڈرانے والا ہے۔ اور یوں تو اہل عرب کو یہود و نصاریٰ اپنے اپنے دین کی طرف بلاتے رہے اور **زید بن عمرو بن نفیل اور قیس بن ساعدہ** گو خود بت پرستی سے مجتنب تھے اور ضرور ہے کہ دوسروں کو بھی توحید کی تعلیم دیتے ہوں، مگر خدا کی طرف سے نبی نہ تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ انہیں کامیابی نہیں ہوئی۔ بلکہ بعثت رسول سے بالکل متصل اس قسم کے آدمیوں کا ظاہر ہونا اور ان کے ذریعہ سے عرب کی حالت میں ادنیٰ تغیر کا پیدا نہ ہونا اور پھر نبی ﷺ کی بعثت سے ایک انقلاب عظیم کا وقوع میں آنا صاف بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تائید غیبی آنحضرت ﷺ کے لیے کام کر رہی تھی۔ ورنہ انسان کی طاقت قطعاً وہ نہ تھی جو آپ نے کر دکھایا۔ اور **خالد بن سنان العبسی** اکثر کے نزدیک نبی نہیں اور بعض روایات میں جو لفظ نبی اس کے متعلق آیا ہے تو وہ بطور مجاز ہوگا۔

یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْهِ فِیْ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝۵

وہ اس امر کی تدبیر آسمان سے زمین کی طرف کرتا ہے، پھر وہ اس کی طرف چڑھ جائے گا ایک دن میں جس کا اندازہ ایک ہزار سال ہے اس سے جو تم گنتے ہو۔ (2616)

2616- ﴿یُدَبِّرُ﴾ تَدْبِیْرٌ کے اصل معنی ہیں عواقب امور میں فکر کرنا [دیکھو نمبر: 702] اور اللہ تعالیٰ کے حق میں اس سے مجاز مراد ہے یعنی کسی چیز کا مضبوطی کے طور پر اور رعایت حکمت سے ارادہ کرنا اور مراد اس سے انزال ہے۔ (ر)

امر اسلام کے استحکام میں ایک ہزار سال کے لیے روک کا واقع ہونا:

اس آیت کے معنی میں کئی ایک اقوال مفسرین نے بیان کیے ہیں۔ ایک یہ کہ آسمان اور زمین میں پانچ سو سال کی مسافت ہے اور یوں آسمان سے ایک امر کے نازل ہونے میں اور پھر چڑھنے میں ایک ہزار سال لگ جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ ملائکہ کی وساطت سے تدبیر امور کرتا ہے پھر ملائکہ کے عروج میں ہزار سال لگتا ہے۔ تیسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ ایک ہزار سال کے امور کا فیصلہ کر کے ملائکہ کے سپرد کر دیتا ہے۔ (ج) یہ اقوال قابل قبول نہیں۔ اس لیے کہ ملائکہ کے آنے جانے میں کسی وقت کا لگنا یا ایک ہزار سال کے معاملات کا فیصلہ کرنا اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ میں ایک نقص کو لازم ٹھہرانا ہے۔ اللہ کے لیے بُعدِ مسافت یا بُعدِ زمانی کو ماننا اس کے لیے جسم کو قبول کرنا ہے اور وہ اس سے پاک ہے اور بعض نے یہاں ﴿الْاَمْرَ﴾ سے مراد وحی یا شریعت کا نزول لیا ہے۔ گویا ﴿یُدَبِّرُ الْاَمْرَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ جبریل کے ساتھ وحی کو نازل کرتا ہے پھر وہ ایک ہزار سال میں اس کے قبول یا رد کو لے کر اوپر چڑھتا ہے۔ (ر) اس کے دوسرے حصہ میں وہی نقص ہے جو پہلے اقوال میں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ الْاَمْرَ سے مراد وحی یا شریعت اسلام یا امر اسلام ہی ہے اور اللہ تعالیٰ کا اس کی تدبیر فرمانا اس کو دنیا میں محکم اور مضبوط کرنا ہے جیسا کہ تدبیر کے معنی سے ظاہر ہے۔ اور اگلی آیت کے الفاظ ﴿عٰلِمُ الْغَیْبِ وَ الشَّهَادَةِ﴾ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ﴿یَعْرُجُ اِلَیْهِ﴾ میں کسی علم غیب کا اظہار ہے اور علم غیب کا اظہار عموماً پیشگوئی کے رنگ میں ہوتا ہے۔ پس یہاں امر اسلام کے متعلق کوئی پیشگوئی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ تدبیر یعنی اتقان کے مقابل پر اس کا کمزور ہونا یا اس کی ترقی کا رک جانا جسے یہاں ﴿یَعْرُجُ اِلَیْهِ﴾ سے ظاہر کیا ہے۔ اور حدیث صحیح میں ہے کہ میرے بعد تین قرن اعلیٰ درجہ کے ہیں [خَيْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِي ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ] (جامع العلوم والمحقق، الحديث السابع والاربعون، جلد49، صفحہ11) اور قرن کی سب سے بڑی میعاد ایک سو سال مانی گئی ہے۔ دیکھو نہایہ۔ اور خود نبی کریم ﷺ نے اپنے قرن کو ایک سو سال قرار دیا۔ جب فرمایا کہ ایک سو سال میں وہ کل لوگ جو اس وقت زندہ ہیں مر جائیں گے۔ اور ایک حدیث میں یہ ہے کہ آپ نے ایک لڑکے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا عِشْ قَرْنًا تو وہ ایک سو سال زندہ رہا۔ (ن) پس وہ تین قرن جنہیں حدیث اسلام کی مضبوطی کا زمانہ قرار دیتی ہے۔ تین سو سال ہیں اور یہی زمانہ ﴿یُدَبِّرُ الْاَمْرَ﴾ کا ہے اور اسی حدیث میں آتا ہے کہ اس کے بعد کذب وغیرہ ظاہر ہو جائے گا۔ یعنی مسلمان اس

ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۙ﴿۶﴾

وہ غیب اور موجود کا جاننے والا ہے، غالب رحم کرنے والا۔

الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَ بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۚ﴿۷﴾

جس نے ہر چیز کو جو اس نے پیدا کی اچھا بنایا اور انسان کی پیدائش کو مٹی سے شروع کیا۔ (2617)

ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۚ﴿۸﴾

پھر اس کی نسل ایک نچوڑ سے ٹھہرائی (جو) کمزور پانی میں (آجاتا ہے)۔

ثُمَّ سَوّٰىهُ وَ نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿۹﴾

پھر اسے ٹھیک بنایا اور اپنی روح اس میں پھونکی اور تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنائے، بہت ہی کم تم شکر کرتے ہو۔ (2618)

اعلیٰ حالت سے گر جائیں گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ اسلام کی ترقی رک جائے گی اور ایک ہزار سال کا محدود زمانہ اس روک کے لیے معین فرما کر یہ بتا دیا کہ اس کے بعد پھر امر اسلام ترقی کرے گا اور اگر یہ مراد ہوتی کہ پھر حالت تنزل ہی رہے گی۔ تو ہزار سال کی قید نہ لگائی جاتی اور [آیت:9] میں ﴿قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ﴾ بھی اسی طرف اشارہ کرتا ہے کہ انسانوں کی ناشکر گزاری ہی اس روک کا باعث ہے۔ یہ چونکہ اس مجموعہ الٓمّٓ کی جس میں اسلام کی کامیابیوں کا ذکر ہے آخری سورت ہے۔ اس لیے اس میں کامیابی کی خوش خبری کے ساتھ ترقی کی روک کی میعاد کا ذکر بھی کر دیا ہے۔

2617- ہر چیز کو خوبصورت بنایا اور اس کا حسن اسی لحاظ سے ہے کہ وہ اقتضائے حکمت کے مطابق بنی ہے اور انسان کو سب سے خوبصورت بنایا ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۫﴾ [التین: 4:95] ''یقیناً ہم نے انسان کو بہترین صورت پر پیدا کیا ہے۔'' اور مٹی سے پیدائش ہر انسان کی شروع ہوتی ہے نہ صرف آدم کی، پھر اس مٹی سے ﴿سُلٰلَةٍ﴾ یعنی خلاصہ بنتا ہے۔ [دیکھو نمبر: 2254] پھر وہ ﴿مَّآءٍ مَّهِيْنٍ﴾ یعنی نطفہ کی شکل میں آتا ہے۔

2618- ﴿سَوّٰىهُ﴾ یعنی حالت اعتدال پر بنایا اور اس کے بعد اپنی روح نفخ کی۔ یہاں بتایا کہ **اللہ تعالیٰ کی روح ہر انسان میں نفخ ہوتی ہے**۔ روح حیوانی تو حیوان اور انسان میں مشترک ہے، پس وہ مراد نہیں ہو سکتی۔ ورنہ انسان کا ذکر الگ کر کے اس کا ذکر نہ کیا جاتا۔ پس یہ روح وہ چیز ہے جو انسان کو دیگر حیوانات سے ممتاز کرتی ہے یعنی نفس ناطقہ یا تمیز اور شکر کی صفت جس کی طرف آیت

وَ قَالُوْۤا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ ؕ بَلْ هُمْ بِلِقَآىِٕ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ ۝۱۰

اور کہتے ہیں کیا جب ہم زمین میں گم ہو جائیں گے، کیا پھر ہم نئی پیدائش میں (زندہ) ہوں گے؟ بلکہ وہ اپنے رب کی ملاقات کا انکار کرنے والے ہیں۔

قُلْ یَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِیْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ۝۱۱ ع 1 11 14

کہہ، موت کا فرشتہ تمہاری روح قبض کرتا ہے جو تم پر مقرر کیا گیا ہے۔ پھر تم اپنے رب کی طرف لوٹائے جاتے ہو۔

وَ لَوْ تَرٰۤى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ رَبَّنَاۤ اَبْصَرْنَا وَ سَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ ۝۱۲

اور اگر تو دیکھے جب مجرم اپنے رب کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہوں گے۔ ہمارے رب ہم نے دیکھ لیا اور سن لیا سو ہمیں واپس بھیج ہم اچھے عمل کریں گے (اب) ہمیں یقین آ گیا۔

وَ لَوْ شِئْنَا لَاٰتَیْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا وَ لٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّیْ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ۝۱۳

اور اگر ہم چاہتے تو ہر شخص کو اس کی ہدایت دے دیتے لیکن میری طرف سے بات سچی ہوئی، میں ضرور دوزخ کو جنوں اور انسانوں سب سے بھر دوں گا۔ (2619)

کے آخر میں توجہ دلائی ہے، اسی سے پیدا ہوتی ہے۔ دوسری مخلوقات کو نہیں کہا کہ وہ شکر کرتے ہیں یا نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف روحی کی اضافت بلحاظ تشریف کے ہے جیسے بَیْتُ اللّٰہ۔ نَاقَۃُ اللّٰہِ میں۔ عیسائیوں کو فخر ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو ﴿رُوْحٌ مِّنَ اللّٰهِ﴾ کہا ہے یہاں ہر انسان میں اللہ کی روح کے نفخ کا ذکر ہے۔

2619- **جہنم کو بھرنے کے متعلق اللہ تعالیٰ کا قول:** وہ قول کیا ہے؟ دوسری جگہ شیطان کہتا ہے ﴿لَاُغْوِیَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ ۝۳۹ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِیْنَ ۝۴۰﴾ [الحجر: 15:39-40] ''ان سب کو (حصول مقصد میں) ناکام رکھوں گا۔ سوائے تیرے بندوں کے جو ان میں سے خالص کیے گئے ہیں۔'' جس پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ﴿فَالْحَقُّ ۫ وَ الْحَقَّ اَقُوْلُ ۝۸۴ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَ مِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِیْنَ ۝۸۵﴾ [ص: 38:84-85] ''تو حق یہ ہے اور میں حق ہی کہتا ہوں۔ میں ضرور جہنم کو تجھ سے اور ان سب سے جو تیری پیروی کریں بھر دوں گا۔'' پس اللہ تعالیٰ کا قول جو واقع ہوا وہ یہ تھا کہ شیاطین اور ان کے پیرو جہنم میں جائیں

فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۚ اِنَّا نَسِيْنٰكُمْ وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾

سو چکھو اس لیے کہ تم اس دن کی ملاقات کو بھولے رہے۔ ہم نے بھی تمہیں بھلا دیا اور دیر پا عذاب چکھو، اس کے عوض جو تم کرتے تھے۔

اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۱۵﴾ السجدة

ہماری آیتوں پر صرف وہی ایمان لاتے ہیں کہ جب انہیں ان سے نصیحت کی جاتی ہے وہ سجدہ کرتے ہوئے گر جاتے ہیں اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے۔ (2620)

تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا ۫ وَّ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۱۶﴾

ان کے پہلو بستروں سے الگ ہو جاتے ہیں، وہ اپنے رب کو ڈرتے ہوئے اور امید رکھتے ہوئے پکارتے ہیں۔ اور اس سے جو ہم نے انہیں دیا ہے خرچ کرتے ہیں۔ (2621)

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّاۤ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ

پس کوئی شخص نہیں جانتا کہ ان کے لیے کیسی آنکھوں کی

گے اور ﴿لَوْ شِئْنَا﴾ میں بتایا کہ اگر ہماری مشیت ایسی ہوتی کہ انسان کو پیدا ہی ایسا کرتے کہ وہ ہمارے حکم کی مخالفت نہ کر سکتا اور ایک راہ اختیار کرنے پر مجبور ہوتا جیسا دوسری مخلوق مجبور ہے، تو ہم ایسا بھی کر سکتے تھے۔

2620- یہاں بتایا کہ منہ سے اپنے آپ کو مومن کہہ دینا کافی نہیں جب تک کہ احکام الٰہی کی کامل فرمانبرداری اور ان کے احکام کے آگے پورا سر جھکا دینا نہ ہو۔ آج اسی بات کو مدنظر نہ رکھنے سے مسلمان اپنے مصائب کی صحیح وجہ کو معلوم نہیں کر سکتے۔

2621- ﴿تَتَجَافٰى﴾ جَفَا اور تَجَافٰى کے معنی ہیں ایک چیز اپنی جگہ پر نہ رہی جیسے زین اور [تَجَافَىٰ جَنْبِهِ عَنِ الْفِرَاشِ] اس کا پہلو بستر سے الگ ہو گیا۔ (ل) اور یہ نیند کے ترک کرنے سے کنایہ ہے۔ اور احمد اور ترمذی کی ایک حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ نے [صَلَاةُ الرَّجُلِ فِيْ جَوْفِ اللَّيْلِ] یعنی رات کے درمیان میں نماز کا ذکر کر کے یہ آیت پڑھی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد نماز تہجد ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ تہجد کی نماز میں انسان کو بستر سے الگ ہونا یا نیند کو ترک کرنا پڑتا ہے اور یہ گویا اخفاء میں نماز ہے۔ اسی لیے اس کے اجر کے ذکر میں فرمایا ﴿مَّاۤ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ﴾۔

قُرَّةِ اَعْیُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۷﴾

ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے۔ اس کا بدلہ جو وہ کرتے تھے۔ (2622)

اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا ؕ لَا یَسْتَوٗنَ ﴿۱۸﴾ وقف لازم

تو کیا وہ جو مومن ہے اس کی طرح ہو سکتا ہے جو نافرمان ہے، وہ برابر نہیں ہو سکتے۔

اَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ جَنّٰتُ الْمَاْوٰی ۫ نُزُلًۢا بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۹﴾

وہ جو ایمان لاتے ہیں اور اچھے عمل کرتے ہیں تو ان کا ٹھکانا باغ ہیں (یہ ان کی) مہمانی ہے، اس کا بدلہ جو وہ کرتے تھے۔

وَ اَمَّا الَّذِیْنَ فَسَقُوْا فَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ كُلَّمَاۤ اَرَادُوْۤا اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنْهَاۤ اُعِیْدُوْا فِیْهَا وَ قِیْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۲۰﴾

اور جو نافرمان ہیں تو ان کا ٹھکانا آگ ہے، جب کبھی چاہیں گے کہ اس سے نکل جائیں اس میں لوٹا دیئے جائیں گے۔ اور انہیں کہا جائے گا کہ آگ کا عذاب چکھو جسے تم جھٹلاتے تھے۔

2622- **نعمائے جنت کی اصل حقیقت:** بخاری میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: [يَقُولُ اللهُ تَعَالىٰ: "أَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصَّالِحِينَ مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ، وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ، وَلَا خَطَرَ عَلىٰ قَلْبِ بَشَرٍ] (صحيح البخاری، كتاب التفسير، باب قَوْلِهِ (فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ): 4780) یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں نے اپنے صالح بندوں کے لیے وہ کچھ تیار کیا ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل پر گزرا اور تب آپ نے یہ آیت پڑھی ﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ﴾۔ اور ابن جریر کی ایک روایت میں ہے [مَالَمْ يَسْمَعْهُ مَلِكٌ مُقَرَّبٌ] یعنی وہ ایسی نعمتیں ہیں کہ کسی مقرب فرشتہ نے بھی انہیں نہیں سنا۔ پس جنت اور اس کی نعماء کے متعلق یہ حدیث اور آیت فیصلہ کن ہیں کہ وہ اور رنگ کی نعمتیں ہیں اور اس دنیا کی نعمتوں پر ان کا قیاس کرنا صحیح نہیں۔ اس لیے قیاس میں تو وہی چیز آئے گی جو دل میں گزرے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ کسی بشر کے دل پر بھی نہیں گزریں۔

وَ لَنُذِیْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ﴿۲۱﴾

اور ضرور ہم انہیں نزدیک کا عذاب بڑے عذاب سے پہلے چکھائیں گے تاکہ وہ رجوع کریں۔ (2623)

وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰیٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا ؕ اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِیْنَ مُنْتَقِمُوْنَ ﴿۲۲﴾ ع 2 11 15

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جسے اپنے رب کی آیتوں کے ساتھ نصیحت کی جائے پھر وہ ان سے منہ پھیر لے، ہم مجرموں کو سزا دینے والے ہیں۔

وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَلَا تَكُنْ فِیْ مِرْیَةٍ مِّنْ لِّقَآىِٕهٖ وَ جَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ﴿۲۳﴾ ج

اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی سو تو اس کے ملنے سے شک میں نہ رہ، اور ہم نے اسے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا۔ (2624)

وَ جَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىِٕمَّةً یَّهْدُوْنَ

اور ان میں سے ہم نے امام بنائے جو ہمارے حکم سے

2623- ﴿الْعَذَابِ الْاَدْنٰى﴾ سے مراد بعض نے یوم بدر، بعض نے قتل وجوع، بعض نے مصائب دنیا لی ہیں۔ اور اصل یہی ہے کہ اس سے مراد دنیا میں عذاب کا آنا ہے اور ﴿الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ﴾ سے مراد اکثر نے **عذاب آخرت** لیا ہے اور بعض نے قتل واسیری۔ (ر) ہوسکتا ہے کہ یہ دونوں عذاب دنیوی ہی ہوں۔ ایک چھوٹے چھوٹے عذاب اور ایک وہ عذاب جس نے ان کی قوت کا استیصال کلی کر دیا۔ مگر عذاب ادنیٰ سے مراد عذاب دنیا اور عذاب اکبر سے مراد عذاب آخرت زیادہ قرین قیاس ہے۔ گویا دو عذابوں کا اکٹھا وعدہ دیا۔ ایک اس دنیا کا عذاب دوسرا آخرت کا۔ دنیا کے عذاب نے ان پر قطعی طور پر ثابت کر دیا کہ دوسرا وعدہ بھی سچا ہے۔

2624- ﴿لِّقَآىِٕهٖ﴾ میں ضمیر بعض نے جنس کتاب کی طرف لی ہے یعنی تجھے بھی کتاب مل کر رہے گی اور بعض نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف اور مراد اس سے لیلۃ المعراج کی ملاقات کو لیا ہے۔ مگر یہ دونوں باتیں کمزور ہیں۔ اصل میں یہاں خطاب عام ہے یعنی ہر مخاطب کو کہا ہے نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کہ اس کے لقاء میں شک نہ کرو۔ اور لقاء ایک ہی ہے جس کا ذکر قرآن شریف میں آتا ہے۔ اور اس کا ذکر یہاں بھی پیچھے آچکا ہے ﴿بَلْ هُمْ بِلِقَآىِٕ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ﴾ [10] یعنی لقاء اللہ۔ پس یہاں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دینے کا ذکر کر کے جس کا ذکر جملہ معترضہ کے طور پر بیان فرمایا کہ جن باتوں سے تمہیں استبعاد معلوم ہوتا ہے ﴿وَ قَالُوْۤا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ﴾ [10]۔ یعنی حیات بعد الموت وہی موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم بھی تھی۔ پس تم لقاء اللہ میں شک نہ کرو۔

بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ؕ۟ وَ كَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یُوْقِنُوْنَ ﴿۲۴﴾

ہدایت کرتے تھے جب انہوں نے صبر کیا اور وہ ہماری آیتوں پر یقین رکھتے تھے۔

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ یَفْصِلُ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْمَا كَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ﴿۲۵﴾

تیرا رب ہی قیامت کے دن ان میں ان باتوں کا فیصلہ کرے گا جن میں وہ اختلاف کرتے تھے۔

اَوَ لَمْ یَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ یَمْشُوْنَ فِیْ مَسٰكِنِهِمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ ؕ اَفَلَا یَسْمَعُوْنَ ﴿۲۶﴾

کیا ان کے لیے یہ واضح نہیں ہوا کہ اس سے پہلے ہم نے کتنی نسلوں کو ہلاک کیا جن کے گھروں میں یہ چلتے پھرتے ہیں۔ یقیناً اس میں نشان ہیں، تو کیا وہ سنتے نہیں؟

اَوَ لَمْ یَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ اِلَى الْاَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا تَاْكُلُ مِنْهُ اَنْعَامُهُمْ وَ اَنْفُسُهُمْ ؕ اَفَلَا یُبْصِرُوْنَ ﴿۲۷﴾ ع

اور کیا وہ غور نہیں کرتے کہ ہم پانی کو سبزی سے خالی زمین کی طرف چلاتے ہیں، پھر اس کے ساتھ کھیتی نکالتے ہیں جس سے ان کے چارپائے اور وہ خود کھاتے ہیں، تو کیا دیکھتے نہیں۔ (2625)

وَ یَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْفَتْحُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۲۸﴾

اور کہتے ہیں یہ فیصلہ کب ہوگا، اگر تم سچے ہو؟

2625- یوں تو یہ اللہ تعالیٰ کا عام قانون ہے مگر یہاں خاص اشارہ عرب کی بنجر زمین کی طرف ہے جو کسی اثر کو قبول نہ کرتی تھی۔ تو فرمایا کہ ہم یہاں بھی کھیتی اگائیں گے یعنی اس زمین میں زندگی پیدا کریں گے۔ اور ان لوگوں کے روحانی قویٰ نشوونما پائیں گے۔ یہاں تک کہ وہ نہ صرف خود فائدہ اٹھائیں گے بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی فائدہ پہنچائیں گے اور انہیں بھی جو ضلالت اور گمراہی میں چارپایوں کی طرح ہیں اس سے پہلی آیت میں اعدائے حق کی ہلاکت کی طرف اشارہ ہے۔ تو یہاں نیکوں اور راست بازوں کی جماعت کے قیام کی طرف اشارہ ہے وہ کفار ہیں، یہ مومن۔ اس لیے اگلی آیت میں ﴿مَتٰى هٰذَا الْفَتْحُ﴾ کا سوال ہے۔ یعنی باطل کی ناکامی اور حق کی اس کامیابی کا فیصلہ کب ہوگا، جس کا ذکر یہاں ہے۔

قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ لَا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِيْمَانُهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۲۹﴾

کہہ، فیصلے کے دن انہیں جو کافر ہیں ان کا ایمان نفع نہ دے گا اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی۔

فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَ انْتَظِرْ اِنَّهُمْ مُّنْتَظِرُوْنَ ﴿۳۰﴾ ع 3 8 16

سو ان سے منہ پھیر لے اور انتظار کر وہ بھی انتظار کرنے والے ہیں۔ (2626)

2626- ﴿انْتَظِرْ﴾ سے مراد ہے ان پر نصرت کا انتظار کر یعنی ان کی ہلاکت کا انتظار کر جس طرح وہ تم پر غلبہ یا تمہاری ہلاکت کا انتظار کرتے ہیں۔

سورۃ الاحزاب

نام:

اس سورت کا نام الْاَحْزَابِ ہے اور اس میں 9 رکوع اور 73 آیتیں ہیں۔ اس کا نام الْاَحْزَابِ اعدائے اسلام کی اس عظیم الشان جمعیت سے لیا گیا ہے جس میں بہت سی عرب کی قومیں شامل ہوئیں اور ایک جرار لشکر مسلمانوں کو کچلنے کے لیے تیار کیا گیا۔ مسلمان جن کی تعداد ان کے سامنے کچھ بھی نہ تھی، مدینہ میں محصور ہو گئے۔ مگر ان کے پائے ثبات میں ذرہ بھی جنبش نہ آئی اور الٰہی نصرت سے یہ لشکر خود ہی بھاگ اٹھا۔ اس سورت کا اصل مضمون یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک کامل نمونہ ہیں اور مسلمانوں کو آپ کے نقش قدم پر چلنا چاہئے۔ اور جنگ احزاب کا ذکر جس پر اس سورت کا نام ہے اس غرض کے لیے لایا گیا ہے کہ کوئی طاقت اس حق کو مٹا نہیں سکتی۔

خلاصہ مضمون:

① پہلے رکوع میں بتایا کہ نبی کا تعلق مومنوں سے کیا ہونا چاہیے اور جسمانی تعلقات کی نفی کرتے ہوئے بتایا ہے کہ آپ کے ساتھ مومنوں کا روحانی تعلق ہے اور آپ کی محبت سب محبتوں پر فائق ہونی چاہیے۔

② دوسرے اور تیسرے رکوع میں جنگ احزاب کا ذکر ہے۔ اور اس میں بھی اصل غرض اس طرف توجہ دلانا ہے کہ مخالفت کی ساری طاقتوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کو حوصلہ نہیں ہارنا چاہیے۔

③ اس لیے تیسرے رکوع کے شروع میں بتایا کہ آنحضرت ﷺ مسلمانوں کے لیے ایک کامل نمونہ ہیں اور زندگی کے ہر شعبہ میں آپ کا نمونہ کام دیتا ہے۔

④ چوتھے رکوع میں ازواج مطہرات کا ذکر کیا اور بتایا کہ نبی کی زوجیت میں ان کے آنے کی غرض یہ نہیں کہ ان کی توجہ دوسری عورتوں کی طرح دنیوی زیب و زینت کی طرف ہو بلکہ محض ایک دینی غرض کو تکمیل کو پہنچانے کے لیے ان کا وجود ہے اور انہوں نے بھی دنیا کی عورتوں کے لیے نمونہ بننا ہے۔

⑥ پانچویں رکوع میں پھر اصل مضمون کی طرف توجہ دلائی کہ آنحضرت ﷺ کی ابوت جسمانی نہیں روحانی ہے۔ اس لیے زید رضی اللہ عنہ نے جسے لوگ آپ کا بیٹا کہہ دیا کرتے تھے جب اپنی بی بی کو طلاق دے دی جو نبی ﷺ کی بہت قریبی رشتہ دار تھیں اور جن کا نکاح نبی کریم ﷺ نے خود زید رضی اللہ عنہ سے کرایا تھا، تو نبی کریم ﷺ کے لیے اس بی بی سے خود نکاح کرنا ضروری ہوا۔ اور اسی تعلق میں بتایا کہ آنحضرت ﷺ رسول ہونے کی حیثیت میں نہ صرف ان لوگوں کے باپ ہیں جو اس وقت آپ پر ایمان لائے

ہیں۔ بلکہ چونکہ آپ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں اس لیے قیامت تک جس قدر مسلمان ہوں گے آپ سب کے روحانی باپ ہیں۔

⑥ چھٹے رکوع میں پھر مضمون کا انتقال آنحضرت ﷺ کی ازواج کی طرف کیا ہے، اور آپ کی ازواج پر حد بندی کا ذکر کیا۔

⑦ ساتویں رکوع میں بتایا کہ منافق وغیرہ کس طرح، طرح طرح کی باتیں کر کے آپ کو ایذا دیتے تھے اور ان ایذا دہی کی باتوں کا علاج بھی بتایا اور ایسی باتیں کرنے والوں کو تنبیہ بھی کی۔

⑧ آٹھویں رکوع میں بتایا کہ ایسی باتیں کرنے والے منافق اور کافر ہیں اور وہ اس کی سزا پا کر رہیں گے۔

⑨ نویں اور آخری رکوع میں بتایا کہ منافق اور کافر اس امانت میں خیانت کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے سپرد کی ہے اور اس خیانت کا نتیجہ یقیناً دکھ ہے۔

تعلق:

مجموعہ الٓمّٓ کی چار سورتیں جو پیچھے گزریں ان میں اسلام کی کامیابی کی پیشگوئیاں کی تھیں۔ اس سورت میں ان پیشگوئیوں کو پورا ہوتے دکھایا ہے کہ کس طرح کفار اپنا پورا زور خرچ کر کے ناکام رہے۔

زمانۂ نزول:

اس سورت کا نزول جنگ احزاب کے زمانہ سے شروع ہوتا ہے۔ اس لیے پانچویں سال ہجرت میں اس کی ابتدا ہے اور ساتویں سال تک کے واقعات کی طرف اس میں اشارہ موجود ہے بلکہ واقعہ ایلاء اور تخییر جو نویں سال ہجرت کا ہے وہ بھی اس میں مذکور ہے۔ اس لیے اس کا نزول پانچویں سال سے لے کر نویں سال تک ہے۔

اٰيَاتُهَا 73 (33) سُوْرَةُ الْاَحْزَابِ مَدَنِيَّةٌ (90) رُكُوْعَاتُهَا 9

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَ لَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۙ﴿۱﴾

اے نبی! اللہ کے تقویٰ پر قائم رہ اور کافروں اور منافقوں کی بات نہ مان۔ اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔[2627]

وَّ اتَّبِعْ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۙ﴿۲﴾

اور اسی پر چل جو تیرے رب کی طرف سے تیری طرف وحی ہوتی ہے۔ اللہ اس سے خبردار ہے جو تم کرتے ہو۔

وَّ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۳﴾

اور اللہ پر بھروسہ رکھ اور اللہ کارساز بس ہے۔

2627- بعض مفسرین نے یہ روایت بیان کی ہے کہ اہل مکہ ولید بن مغیرہ وغیرہ نے آنحضرت ﷺ سے کہا کہ اپنے قول سے رجوع کریں تو وہ اپنے اموال سے انہیں حصہ دیں گے اور بعض نے یہ کہ ابوسفیان نے صلح حدیبیہ کے زمانہ میں رسول اللہ ﷺ سے کہا تھا کہ آپ ہمارے بتوں کا ذکر چھوڑیں اور یہ کہہ دیں کہ وہ شفاعت کریں گے تو ہم آپ کی کچھ مزاحمت نہ کریں گے اور اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ مگر آنحضرت ﷺ کے مدینہ تشریف آوری کے بعد اور اس قدر جنگوں کا سلسلہ لمبا ہو جانے کے بعد کفار کا ایسا کہنا بعید از قیاس ہے، یہ سب باتیں وہ مکہ میں کہہ چکے تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ انتہائی مشکلات کا زمانہ تھا، جنگ احد میں مسلمان بہت کچھ نقصان اٹھا چکے تھے۔ ادھر اب جیسا کہ اگلے رکوع سے ظاہر ہے کہ کفار مکہ ایک جرار لشکر کے ساتھ جس کے مقابلہ کی طاقت مسلمانوں میں نہ تھی، حملہ آور ہو رہے تھے۔ اندر منافق شب و روز ریشہ دوانیاں کر رہے تھے اور انہی کی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ کفار کا یہ حملہ تھا۔ یہ اور اگلی دو آیتیں انہی پریشان کن حالات میں آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کی تسلی کے لیے نازل ہوئیں کہ اللہ ان کا کارساز ہے، اور دشمن کتنا بھی طاقتور ہو کچھ نہیں کر سکتا۔ آنحضرت ﷺ کا **تقویٰ اللہ جس پر** قائم رہنے کی یہاں تاکید فرمائی ہے یہی تھا کہ اس کام کو جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے کھڑا کیا ہے پورا زور لگا کر کرتے جائیں اور **کافروں اور منافقوں کی بات نہ مانیں**۔ کیونکہ یہ دونوں گروہ یہی چاہتے تھے کہ آپ تبلیغ حق کو چھوڑ دیں اور یا اشارہ ان اعتراضات کی طرف ہے جو کافر اور منافق دن رات کرتے تھے۔ کھلے مقابلہ سے بڑھ کر بعض وقت اعتراضات سے انسان گھبرا اٹھتا ہے اور دونوں حکم یعنی تقویٰ کرو اور کفار کی اطاعت نہ کرو، اس حالت پر ثبات کے لیے ہیں۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ ۚ وَ مَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓـِٔيْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ وَ مَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَ هُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ ۝۴

اللہ نے کسی شخص کے لیے اس کے اندر دو دل نہیں بنائے۔ اور نہ تمہاری بیویوں کو جن سے تم ظہار کرتے ہو تمہاری مائیں بنایا ہے اور نہ تمہارے لے پالکوں کو تمہارے بیٹے بنایا ہے۔ یہ تمہاری اپنی منہ کی بات ہے اور اللہ (تعالیٰ) سچ کہتا ہے اور وہی سیدھا رستہ دکھاتا ہے۔ (2628)

2628- ﴿جَوْفِهٖ﴾ جَوْفٌ پست زمین کو کہتے ہیں اور انسان کا جوف اس کا پیٹ یا سارا وہ حصہ ہے جس پر کندھے اور بازو اور پسلیاں اور پہلو منطبق ہوتے ہیں اور ہر چیز کا جَوْفٌ اس کے اندر ہے۔ (ل)

﴿يُظٰهِرُوْنَ﴾ ظَهْرٌ بمعنی پیٹھ سے ہے۔ اور ظِهَارٌ یہ تھا کہ ایک شخص اپنی عورت کو کہتا کہ تو مجھ پر ایسی ہے جیسی میری ماں کی پیٹھ۔ اور ایسے شخص کے متعلق کہا جاتا [ظَاهَرَ مِنْ اِمْرَأَتِهٖ]۔ (غ) اور مطلب یہ ہوتا کہ تو مجھ پر حرام ہے۔ اور یہ ان کی طرف سے ایک قسم کی طلاق ہوتی تھی۔ (ر) اس پر مفصل بحث آگے سورۂ تحریم میں آئے گی۔

﴿اَدْعِيَآءَكُمْ﴾ اَدْعِيَآءُ۔ دَعِيٌّ کی جمع ہے جو فعیل کے وزن پر ہے۔ اور دَعْوَۃٌ طعام میں ہے اور دِعْوَۃٌ نسب میں اور دَعِيٌّ وہ ہے جسے باپ کے سوائے دوسرے کی طرف منسوب کیا جائے۔ اور متبنیٰ کو بھی دَعِيٌّ کہا جاتا تھا۔ (ل)

اس آیت میں اول الفاظ ﴿مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ﴾ میں ان کے متعلق بعض مفسرین کا تو خیال ہے کہ منافقین نے آنحضرت ﷺ کی نماز میں سہو پر یہ بات کہی تھی کہ **آپ کے دو دل ہیں، اس کی تردید یہاں ہے**۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ایک شخص ابو معمر نام تھا جو اہل مکہ میں ذوالقلبین کے نام سے مشہور تھا اور وہ کہا کرتا تھا کہ میرے دو دل ہیں۔ ان میں سے ایک کے ساتھ میں محمد رسول اللہ ﷺ سے زیادہ سمجھتا ہوں۔ مگر آیاتِ قرآنی کے نزول کو ایسے چھوٹے چھوٹے واقعات پر محدود کر دینے سے ان کے نزول کی اصل غرض ہی مفقود ہو جاتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ نبی ﷺ کو جو اتباع وحی کا حکم دیا ہے تو اس میں ساری امت مخاطب ہے اور انہیں سمجھایا ہے کہ انسان کے اندر دو دل نہیں کہ ایک طرف تو دعویٰ ایمان کرے اور دوسری طرف اس کے اعمال اس ایمان کے مطابق نہ ہوں۔ یا ایک دل سے اللہ تعالیٰ پر اور اس کے کلام پر ایمان ہو اور دوسرے دل سے رسم و رواج اور حرص و ہوا کی اتباع ہو۔ اور یا یہ منافقوں کی طرف اشارہ ہے جو ایک طرف دعویٰ ایمان کرتے اور دوسری طرف کفار کو اکساتے رہتے تھے کہ مسلمانوں کو تباہ کریں۔

اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىِٕهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْۤا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِی الدِّیْنِ وَ مَوَالِیْكُمْ ؕ وَ لَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ فِیْمَاۤ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ ۙ وَ لٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۝۵

انہیں ان کے باپوں کے نام سے پکارو یہ اللہ کے نزدیک زیادہ انصاف ہے۔ پھر اگر تم ان کے باپوں کو نہیں جانتے تو وہ دین میں تمہارے بھائی اور تمہارے دوست ہیں اور تم پر اس بارے میں کچھ گناہ نہیں جو تم سے چوک ہو جائے۔ لیکن (وہ گناہ ہے) جو تمہارے دل عمداً کریں اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ (2629)

رسمِ ظہار:

ظِہَار کے مضمون پر مفصل بحث سورۂ تحریم میں آئے گی۔ یہ آیت اس کے بعد کی نازل شدہ ہے اور اس میں صرف اس قدر فرمایا ہے کہ بی بی ماں نہیں بن سکتی۔ رواج جاہلیت یہ تھا کہ بی بی کو ماں کہہ دیا جاتا، لیکن وہ اسی گھر میں رہتی۔ تعلقات زوجیت کے لحاظ سے یہ طلاق تھی۔ مگر عورت گھر کو نہ چھوڑ سکتی تھی نہ دوسری جگہ نکاح کر سکتی تھی۔ قرآن کریم نے اسے ناجائز قرار دیا۔

متبنیٰ بنانے کا رواج:

اور دوسرا رواج جو اکثر قوموں میں اب بھی پایا جاتا ہے کسی کا دوسرے شخص کو بیٹا کہہ دینا تھا اور پھر وہ حق دار وراثت سمجھا جاتا۔ قرآن کریم نے باوجود مسلمانوں میں کمال درجہ کی اخوت پیدا کرنے کے تعلقات نسبی میں اس اخوت کو حائل ہونے نہیں دیا۔ اور جاہلیت کے پرانے رواج کو کہ جہاں دو شخصوں میں مؤاخات ہوتی تو ایک دوسرے کی وفات پر حصہ میراث پاتا منسوخ کر دیا۔ [آیت: 6] میں جس طرح منہ کی اخوت کو بلحاظ وراثت منسوخ کیا اسی طرح منہ کی ابنیت کو بھی منسوخ کیا۔ عورت واقعی مال نہیں ہو سکتی، غیر واقعی بیٹا نہیں ہو سکتا۔ یہ لفظ عام ہیں۔ یعنی ان باتوں کو ہمیشہ کے لیے دور کر دیا۔ اور مفسرین نے جو لکھا ہے یہاں زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی طرف خاص اشارہ ہے، تو یہ بھی صحیح ہے۔ کیونکہ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو لوگ زید بن محمد رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ چونکہ سب مومنوں کا یکساں رشتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قائم کرنا چاہتا تھا اس لیے اسی آیت کی ذیل میں یہ بھی بتا دیا کہ زید رضی اللہ عنہ کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے وہی تعلق روحانی ہے جو دوسرے مسلمانوں کا ہے۔ جسمانی تعلق کوئی نہیں۔ اس روحانی تعلق میں جو جس قدر چاہے زیادہ نسبت پیدا کرے۔ **آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کل امت کا تعلق ابنیت بلحاظ روحانیت ہے** اور رہے گا۔ اور آپ کا بیٹا وہی کہلا سکے گا جو شدید روحانی تعلق آپ سے پیدا کر کے آپ کی صفات روحانی کو اپنے اندر لے۔ اسی کی طرف [آیت: 6] میں اشارہ ہے۔

2629- بخاری میں ہے کہ لوگ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو زید بن محمد کہا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی ﴿اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىِٕهِمْ﴾ اور ﴿فِیْمَاۤ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ﴾۔ اور ﴿مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ﴾ کا تعلق صرف اس بات سے نہیں کہ غلطی سے تم کسی کو بیٹا کہہ دو، بلکہ تمام

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ اَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ ؕ وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُهٰجِرِیْنَ اِلَّاۤ اَنْ تَفْعَلُوْۤا اِلٰۤی اَوْلِیٰٓىِٕكُمْ مَّعْرُوْفًا ؕ كَانَ ذٰلِكَ فِی الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ۝

نبی مومنوں پر ان کی جانوں سے زیادہ حق رکھتا ہے اور اس کی بیویاں ان کی مائیں ہیں۔ اور رشتہ دار اللہ کے حکم میں مومنوں اور مہاجروں کی نسبت ایک دوسرے پر زیادہ حق رکھتے ہیں۔ مگر یہ (دوسری بات ہے) کہ تم اپنے دوستوں سے کچھ اچھا سلوک کرو۔ یہ کتاب میں لکھا ہوا ہے۔ (2630)

امور سے ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ غلطی سے ایک کام کے ہو جانے پر جسے کرنے کا انسان کا منشا نہ تھا، مؤاخذہ نہیں کرتا۔ **بلکہ جو کام عمد سے کیا جائے اس پر مؤاخذہ ہوتا ہے۔** پچھلی آیت میں فرمایا تھا کہ انسان کے سینہ میں دو دل نہیں ہوتے کہ ایک دل سے ایمان کا اقرار کرے اور دوسرے دل سے اس کے خلاف کچھ فعل کرے۔ یہاں بتایا کہ چوک یا خطا ہو جانا امر دیگر ہے۔ یعنی یہ بات ایمان کے منافی نہیں لیکن عمداً کسی فعل کا ارتکاب جو خلاف ایمان ہو نہیں ہونا چاہیے۔

2630- ﴿اَوْلٰی﴾ کے معنی اَدْنٰی اور اَقْرَبُ ہیں یعنی قریب تر۔ اور [اَوْلٰی بِکَذَا] کے معنی ہیں [اَحَقُّ بِهٖ] یعنی اس کا زیادہ حق دار۔ (ل)

اس آیت کے پچھلے حصہ میں **آنحضرت ﷺ اور مومنوں کے باہمی تعلق** کو بیان کیا ہے۔ اور اس کے دو حصے ہیں۔ اول یہ کہ نبی مومنوں سے بہ نسبت ان کی اپنی جانوں کے اولیٰ ہے۔ بخاری میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: [مَا مِنْ مُؤْمِنٍ إِلَّا وَأَنَا أَوْلَى بِهِ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ اقْرَءُوا إِنْ شِئْتُمْ ﴿اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ فَأَيُّمَا مُؤْمِنٍ مَاتَ وَتَرَكَ مَالًا فَلْيَرِثْهُ عَصَبَتُهُ مَنْ كَانُوا وَمَنْ تَرَكَ دَيْنًا أَوْ ضَيَاعًا فَلْيَأْتِنِي فَأَنَا مَوْلَاهُ.] (صحيح البخاری، كتاب الاستقراض، باب الصَّلاَةِ عَلَى مَنْ تَرَكَ دَيْنًا: 2399) ''کوئی مومن نہیں مگر میں دنیا اور آخرت میں سب لوگوں سے بڑھ کر اس کا حقدار ہوں، اگر چاہو تو پڑھو ﴿اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ سو جو کوئی مومن مال چھوڑے تو اس کے رشتہ دار جو کوئی ہوں اس کے وارث ہوں اور اگر وہ قرضہ چھوڑے یا نادار بال بچے چھوڑے تو چاہیے کہ وہ میرے پاس آئے، میں اس کا مولیٰ ہوں۔'' اور جب آپ کی مومنوں پر ایسی شفقت ہے تو **مومنوں کی محبت** بھی آپؐ سے ایسی ہی چاہیے کہ اس کی نظیر بھی کسی دنیوی رشتہ میں نہ ہو۔ اسی لیے فرمایا: [لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ.] (صحيح البخاری، كتاب الإيمان، باب حُبُّ الرَّسُولِ ﷺ مِنَ الإِيمَانِ: 15) ''تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں بنتا جب تک کہ میرے ساتھ اس کی محبت باپ اور بیٹے اور تمام لوگوں سے بڑھ کر نہ ہو۔'' اور اس تعلق کا ذکر اس لیے کیا کہ تا مسلمان یہ جان لیں کہ رسول اللہ ﷺ جو کچھ حکم دیتے ہیں وہ ان کی بھلائی کے

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِیّٖنَ مِیْثَاقَهُمْ وَ اور جب ہم نے نبیوں سے ان کا عہد لیا اور

لیے ہے۔اوراس کی تعمیل میں انہیں جلدی کرنی چاہیے۔

دوسری بات جو بیان فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ **آنحضرت ﷺ کی بیبیاں مومنوں کی مائیں ہیں**۔ یہاں پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ابھی تو فرمایا تھا کہ منہ سے کہہ دینے سے کوئی عورت ماں نہیں بن جاتی اور یہاں فرمایا کہ نبی کی بیبیاں مومنوں کی مائیں ہیں۔ تو کیا یہ منہ سے کہہ دینا نہیں؟ ایسا خیال کرنا سخت غلطی ہوگی۔قرآن کریم نے اگر تعلقات نسبی کی عزت کو قائم کرکے اس بات سے روکا کہ جو ماں نہ ہو اسے ماں کہو اور جو بیٹا نہیں اسے بیٹا کہو۔تو اب ساتھ ہی یہ بھی بتادیا کہ تعلقات نسبی کی جو محض جسمانی ہیں اس عزت کے ساتھ تعلقات روحانی کی عزت کو بھی مدنظر رکھو۔رسول اللہ ﷺ سے بے شک مومنوں کے تعلقات نسبی کوئی نہیں،لیکن تعلقات نسبی سے بھی شدید تر تعلقات روحانی ہیں۔اس لیے جب مومنوں پر آپ کی شفقت کا اظہار کیا تو ساتھ ہی بتایا کہ یہ شفقت اس روحانی تعلق کی وجہ سے ہے جو نبی کو تمہارے ساتھ ہے اور یہاں یوں نہیں فرمایا کہ وہ تمہارے باپ ہیں۔ بلکہ یہ فرمایا کہ اس کی بیبیاں تمہاری مائیں ہیں۔کیونکہ اس سے دو مقصد حاصل ہوئے۔ایک تو آپ کی **ابوت اس سے ایسی ہی ثابت ہوئی** جیسے ان صریح الفاظ سے ہوتی ہے هُوَ اَبٌ لَّهُمْ اور بعض قراءتوں میں جو یہاں یہ لفظ آئے ہیں تو ان کا مطلب بھی یہی ہے کہ آپ کی بیبیوں کو مومنوں کی مائیں کہنا ایسا ہی ہے جیسا آنحضرت ﷺ کو مومنوں کے باپ قرار دینا۔اور دوسرا مقصد ان الفاظ سے یہ حاصل ہوا کہ نہ صرف آپ کی بیبیوں کی تکریم ثابت ہوئی اور اس سے بھی بڑھ کر یہ ثابت ہوا کہ جو شخص مستحق عزت ہے اس کی بی بی اس کے تعلق سے مستحق عزت ہوجاتی ہے۔بلکہ ان الفاظ میں ایک گہرا راز ہے جس کی طرف آج تک توجہ نہیں ہوئی اور وہ یہ ہے کہ جب ماں بلحاظ نسب وہ ہے جو بچہ کو جسمانی طور پر پرورش کرتی ہے تو ماں بلحاظ روحانیت وہ ہے جو بچہ کی روحانی پرورش کرتی ہے۔آنحضرت ﷺ کا اپنی امت کا روحانی باپ ہونا تو ایک امر ظاہر تھا کیونکہ آپ سے ہی نور، ایمان، ہدایت سب کچھ ملا۔لیکن ان الفاظ میں یہ بتایا کہ آنحضرت ﷺ کی بیبیاں بھی محض اس غرض کو پورا نہیں کرتیں جس کا ذکر ﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ﴾ میں یا ﴿لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا﴾ میں ہے۔بلکہ وہ **مومنوں کے لیے روحانی ماں کا حکم بھی رکھتی ہیں**۔یعنی مومنوں کی روحانی پرورش بھی ان کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔اور وہ دین کے اس کثیر حصہ میں جو انسان کے لیے اس دنیا میں جنت کا حکم رکھتا ہے یعنی معاشرت کے حصہ میں مومنوں کے لیے اخلاق اور افعال نبوی کو محفوظ رکھ کر اور پھر دنیا کی عورتوں کے لیے نمونہ اور رہنما بن کر مومنوں کی روحانی مائیں بن گئیں۔

آیت کے پچھلے حصہ میں بیان کیا ہے کہ میراث وغیرہ تعلقات اخوت دینی کے لحاظ سے نہیں پہنچتیں بلکہ تعلقات رشتہ کے لحاظ سے۔اور چونکہ مہاجرین کے ساتھ انصار کی اخوت خصوصیت سے قائم ہوئی تھی اس لیے یہاں مہاجرین کا ذکر بالخصوص کیا ہے۔ تفصیل کے لیے[دیکھو نمبر: 649]۔

مِنْكَ وَ مِنْ نُّوْحٍ وَّ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۪ وَ اَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۙ﴿۷﴾

تجھ سے (بھی لیا) اور نوح اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ ابن مریم سے اور ہم نے ان سے پختہ عہد لیا۔ (2631)

لِّيَسْـَٔلَ الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ ۚ وَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۸﴾ ع 1 8 17

تاکہ وہ سچوں سے ان کی سچائی کے متعلق سوال کرے اور اس نے کافروں کے لیے دردناک عذاب تیار کیا ہے۔ (2632)

2631- **نبیوں کے عہد** سے وہی مراد ہے جو ﴿مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ﴾ [آل عمران: 81:3] سے۔ [دیکھو نمبر: 472]۔ یہ عہد نبی کریم ﷺ کے متعلق تھا یعنی یہ کہ سب نبیوں کے آخر پر ایک نبی آئے گا جو سب کا مصدق ہوگا اور جس پر سب قوموں کو ایمان لانا ہوگا۔ چنانچہ قتادہ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبیوں سے یہ عہد لیا تھا کہ وہ ایک دوسرے کی تصدیق کریں گے اور رسول اللہ ﷺ کے متعلق اعلان کریں گے اور رسول اللہ ﷺ کا اعلان کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔ (ر) اور نبیوں کے میثاق کے بعد پھر جو فرمایا ﴿مِنْكَ وَ مِنْ نُّوْحٍ﴾ تو اس کی عام توجیہ یہ کی گئی ہے کہ یہ عطف خاص علی العام ہے۔ اور گو پہلے نبیوں میں یہ شامل ہوں مگر بوجہ ان کی فضیلت کے ان کا ذکر خصوصیت سے کیا۔

آنحضرت ﷺ کن معنوں میں اول النبیین ہیں:

اور یہاں جو مِنْكَ میں نبی ﷺ کا ذکر سب سے پہلے کیا تو یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے جو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: [كُنْتُ أَوَّلُ النَّبِيِّيْنَ فِي الْخَلْقِ وَآخِرُهُمْ فِي الْبَعْثِ] (کنزالعمال، کتاب الفضائل من قسم الأفعال، حدیث: 32126) یعنی ''پیدائش میں سب نبیوں سے اول ہوں اور بعثت میں سب سے آخر۔'' اور پیدائش میں اول ہونا اس لحاظ سے بھی ہے کہ آپ کے بغیر سلسلہ نبوت کی اصل غرض ہی مفقود ہو جاتی ہے۔ مِنْكَ درحقیقت النَّبِيّٖنَ کے مقابل پر ہے۔ کیونکہ نبیوں سے عہد رسول اللہ ﷺ کے متعلق لیا گیا اور رسول اللہ ﷺ سے کل انبیاء کے متعلق اور یہ کل انبیائے عالم کی تصدیق تھی۔ اور ﴿مِنْ نُّوْحٍ وَّ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ﴾ میں چار نبیوں کا خصوصیت سے ذکر ہے۔ جن میں سے نوح علیہ السلام سب سے پہلے نبی ہیں اور ابراہیم علیہ السلام ابوالانبیاء ہیں جن سے سلسلہ موسوی اور سلسلۂ محمدی مجتمع ہوتے ہیں اور موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام سلسلہ موسوی کے اول و آخر ہیں۔ جس سلسلہ کو سلسلہ محمدی سے کمال مشابہت حاصل ہے اور یہ آیت یہاں آپ کی عظمت کے اظہار کے لیے لائی گئی ہے۔

2632- چونکہ سلسلہ نبوت کی اصل غرض یہی ہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں صدق دکھائیں اس لیے اس بات کو بطور نتیجہ بیان کیا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ۚ﴿۹﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو یاد کرو جب تم پر لشکر چڑھ آئے، سو ہم نے ان پر ہوا کو اور ایسے لشکروں کو بھیجا جنہیں تم نے نہیں دیکھا اور اللہ اسے جو تم کرتے ہو دیکھتا ہے۔ (2633)

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَ مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَ اِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَ بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَ تَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ﴿۱۰﴾

جب وہ تمہارے اوپر سے اور تمہارے نیچے سے تم پر آ گئے اور جب آنکھوں میں اندھیرا آ گیا اور دل (دہشت سے گویا) گلوں تک پہنچ گئے اور تم اللہ پر مختلف قسم کے ظن کرنے لگے۔ (2634)

2633- یہاں سے **جنگ احزاب** کا ذکر شروع ہوتا ہے اور اسی پر سورت کا نام ہے۔ اور اس ذکر کے لانے کی غرض یہ دکھانا ہے کہ مومنوں کا ایمان آنحضرت ﷺ پر کس قدر تھا کہ چاروں طرف سے دشمنوں کے نرغہ میں آجانے پر بھی ان کا ایمان آخری کامیابی پر اس قدر مضبوط تھا کہ وہ بول اٹھے ﴿هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ﴾۔ ﴿جُنُوْدٌ﴾ سے مراد یہاں احزاب ہی ہیں اور یہ ذیل کی قومیں تھیں۔ قریش (ابوسفیان کے ماتحت)، بنو اسد، غطفان، بنو عامر، بنو سلیم، بنی نضیر، بنی قریظہ اور مؤخر الذکر رسول اللہ ﷺ سے عہد شکنی کر کے ان کے ساتھ شامل ہو گئے اور ان کی تعداد بعض روایات کی رو سے دس ہزار اور بعض کی رو سے پندرہ ہزار تھی۔ رسول اللہ ﷺ کو جب ان کی چڑھائی کی خبر ملی تو سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورہ سے آپ نے مدینہ کے گرد خندق کھدوائی اور چالیس چالیس گز کا ٹکڑا دس دس آدمیوں کے سپرد کیا، اور آپ کے ساتھ تین ہزار آدمی تھے۔ یہ واقعہ شوال 5 ہجری کا ہے قریب ایک ماہ کے دونوں فوجیں ایک دوسرے کے آمنے سامنے پڑی رہیں۔

آنحضرت ﷺ کا معجزہ:

تب اللہ تعالیٰ کی نصرت رِیْحٌ یعنی ہوا کی صورت میں آئی اور ﴿جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا﴾ سے مراد ملائکہ ہیں جنہوں نے دشمن کو باوجود اس کی اتنی کثرت کے کہ پانچ گنا ان کی تعداد تھی ایسا مرعوب کیا کہ وہ راتوں رات بھاگ گئے اور یہ سخت ٹھنڈی ہوا تھی جو ٹھنڈی رات میں چلی اور اس قدر زور کی چلی کہ مٹی اور کنکر ان کے منہ پر پڑتے تھے اور آگ بجھ گئی اور ہانڈیاں گر گئیں اور خیموں کی میخیں اکھڑ گئیں اور رسیاں ٹوٹ گئیں اور گھبراہٹ میں پندرہ ہزار فوج راتوں رات بھاگ گئی۔ یہ نبی کریم ﷺ کا کھلا معجزہ ہے کہ اس قدر کثیر دشمن سے ایک آندھی کے ذریعہ سے مسلمانوں کو بچا لیا۔ حالانکہ آندھی تو دونوں فریق پر یکساں چلی، مگر ایک گروہ کے لیے نجات کا اور دوسرے کے لیے ہلاکت کا موجب ہو گئی۔ یہ معجزہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے فلق بحر کے معجزہ سے کم نہیں۔

2634- ﴿زَاغَتِ﴾ زَیْغٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 376] اور ﴿زَاغَتِ الْاَبْصَارُ﴾ کے معنی ہیں اپنی جگہ سے مائل ہو گئیں یعنی ایک طرف جھک

هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ زُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ﴿۱۱﴾

وہاں مومن آزمائے گئے اور سخت مصائب میں ڈالے گئے۔

وَ اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۱۲﴾

اور جب منافق اور وہ جن کے دلوں میں بیماری تھی کہنے لگے اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے جو وعدہ کیا، نرا دھوکا تھا۔

وَ اِذْ قَالَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ يٰۤاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۚ وَ يَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ

اور جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا اے یثرب کے رہنے والو تمہارے لیے یہاں ٹھہرنے کی جگہ نہیں سو لوٹ چلو اور ان میں سے ایک فریق نبی سے اجازت مانگتا تھا

گئیں۔ جیسا کہ انسان کو حالت خوف میں پیش آتا ہے۔ (ل) اور ہوسکتا ہے کہ یہ اشارہ خوف کی طرف ہو جس کی وجہ سے آنکھوں میں اندھیرا آجاتا ہے اور ہوسکتا ہے کہ یہ اشارہ اس کی طرف ہو جو فرمایا ﴿يَرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ﴾ [آل عمران: 13:3] ''ظاہر آنکھ سے اپنے سے دوچند دیکھتے تھے۔'' (غ)

﴿بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ﴾ حَنَاجِرَ حَنْجَرَةٌ کی جمع ہے جس کے معنی گلا ہیں۔ اور دلوں کے گلوں میں پہنچنے سے مراد ہے کہ دہشت سے گویا وہ اپنی جگہ سے اوپر آ گئے۔ (ل) اور عکرمہ سے ہے کہ دل اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتے ورنہ فوراً جان نکل جائے۔ بلکہ یہ صرف گھبراہٹ کا نقشہ ہے اور خوف کے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا دم رکتا ہے۔ (ر) یہی معنی ﴿اِذِ الْقُلُوْبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كٰظِمِيْنَ﴾ [المؤمن: 18:40] ''جب دل غم سے بھرے ہوئے گلوں تک آ رہے ہوں گے۔'' میں ہیں۔

﴿مِّنْ فَوْقِكُمْ﴾ سے مراد اوپر کی طرف یعنی وادی کی بلند طرف ہے اور یہ مدینہ کا مشرق تھا اور ﴿اَسْفَلَ﴾ سے مراد نچلی یعنی سمندر کی طرف ہے جو مدینہ سے غربی جانب ہے۔ گویا مشرق و مغرب دونوں طرف سے حملہ آور ہوئے اور یا مراد ان کا چاروں طرف سے حملہ آور ہونا ہے۔ اور ﴿الظُّنُوْنَا﴾ سے مراد مختلف قسم کے ظن ہیں۔ یعنی مختلف قسم کے آدمیوں کے ظن مختلف قسم کے تھے۔ منافقوں کا یہ خیال تھا کہ اب تباہ ہوئے اور مومنوں کا خیال اللہ تعالیٰ نے خود اگلے رکوع میں بیان کر دیا ہے۔ [دیکھو آیت: 22] یعنی وہ خوش تھے کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ اب پورا ہوگا یعنی مومنوں کو کامیابی ملے گی۔ اور آنکھوں میں اندھیرا آنا اور دلوں پر دہشت کا چھا جانا بھی منافقوں کے لیے تھا۔ یہ مطلب نہیں کہ سب پر دہشت چھا گئی تھی تاریخ سے بھی یہی ثابت ہے اور قرآن کریم نے خود دو گروہ بنا کر یہ بتا دیا ہے۔ ہاں مومنوں کی آزمائش اور ان پر شدت مصیبت یہ ضرور تھی۔ (زِلْزَالٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 273])

يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ ۛؕ وَ مَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۛۚ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ﴿۱۳﴾

کہتے تھے ہمارے گھر کھلے پڑے ہیں اور وہ کھلے نہیں تھے وہ صرف بھاگنا چاہتے تھے۔(2635)

وَ لَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِّنْ اَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَاٰتَوْهَا وَ مَا تَلَبَّثُوْا بِهَاۤ اِلَّا يَسِيْرًا ﴿۱۴﴾

اور اگر (دشمن) ان پر اس کی اطراف سے داخل ہوتا، پھر ان سے فساد کرنے کو کہا جاتا تو وہ ضرور ایسا کرتے اور بہت ہی کم وہاں ٹھہرتے۔(2636)

وَ لَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّوْنَ الْاَدْبَارَ ؕ وَ كَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْـُٔوْلًا ﴿۱۵﴾

اور پہلے اللہ سے عہد کر چکے تھے کہ پیٹھ نہیں پھیریں گے اور اللہ کے عہد کی پرسش ہوگی۔(2637)

2635- ﴿عَوْرَةٌ﴾ کے لیے [دیکھو نمبر: 2324] یعنی ان میں شگاف ہیں جو چاہے ان میں آ سکتا ہے۔ اور بعض کے نزدیک مراد ہے کہ مردوں سے خالی ہیں یا دیواریں پست ہیں۔ اور مطلب سب صورتوں میں یہ ہے کہ ان میں چوری وغیرہ ہوسکتی ہے۔ ﴿يَثْرِبَ﴾ مدینہ کا پہلا نام ہے [دیکھو نمبر: 1584]۔ اور ﴿لَا مُقَامَ لَكُمْ﴾ سے مراد ہے کہ مکان اقامت تمہارے لیے نہیں یعنی اس قدر زبردست دشمن ہے کہ تم اس کے مقابلہ میں ٹھہر نہیں سکتے۔ اور ﴿فَارْجِعُوْا﴾ سے مراد یہ بھی ہوسکتی ہے کہ مقابلہ سے لوٹ کر اپنے گھروں میں چلے جاؤ جس طرح منافق چلے گئے اور یہ بھی کہ اسلام سے لوٹ کر شرک میں چلے جاؤ۔

2636- ﴿تَلَبَّثُوْا﴾ لَبِثَ اور تَلَبَّثَ کے ایک ہی معنی ہیں کسی جگہ ٹھہرا۔ اور لَبِثَ توقف کرنے کے معنی میں بھی آیا ہے۔ ﴿فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ﴿۶۹﴾﴾ [ھود: 69:11] ''اور دیر نہ کی کہ بھنا ہوا بچھڑا لے آیا۔'' (ل)

﴿اَقْطَارِهَا﴾ سے مراد یہاں شہر کی اطراف ہیں اور مطلب یہ ہے کہ یہی لوگ جو اب گھروں کے کھلا ہونے اور ان میں سرقہ ہو جانے کا اندیشہ ظاہر کرتے ہیں اگر حالت یہ ہوتی کہ دشمن شہر میں داخل ہو جاتا پھر انہیں کہا جاتا کہ مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرو اور انہیں دکھ پہنچاؤ (فِتْنَةَ کے لیے [دیکھو نمبر: 243]) تو فوراً اس کام میں لگ جاتے اور پھر گھروں میں نہ ٹھہرتے۔ ﴿اِلَّا يَسِيْرًا﴾ اس لیے کہا کہ ہتھیار وغیرہ لینے کے لیے جتنا ٹھہرنا پڑتا اتنا ہی ٹھہرتے۔ اس صورت میں گھروں کے کھلا رہنے کا عذر نہ ہوتا۔ حالانکہ جیسا کہ اگلی آیت میں ہے عہد ان کا مسلمانوں کے ساتھ تھا کہ اگر دشمن حملہ آور ہو تو ہم تمہارے ساتھ مل کر دشمن سے جنگ کریں گے۔

2637- مفسرین کہتے ہیں کہ یہ بنو حارثہ یا بنو سلمہ تھے جو جنگ احد میں الگ رہے تھے اور یوم خندق سے پہلے توبہ کی تھی اور عہد کیا تھا۔

قُلْ لَّنْ یَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ اِنْ فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ وَ اِذًا لَّا تُمَتَّعُوْنَ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۱۶﴾

کہہ، تمہیں بھاگنا نفع نہیں دے گا۔ اگر تم موت یا قتل سے بھاگتے ہو اور اس صورت میں تمہیں تھوڑا ہی سامان ملے گا۔

قُلْ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَعْصِمُكُمْ مِّنَ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَ بِكُمْ سُوْٓءًا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً ؕ وَ لَا یَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِیًّا وَّ لَا نَصِیْرًا ﴿۱۷﴾

کہہ، کون ہے جو اللہ سے تمہیں بچا سکے؟ اگر وہ تمہیں تکلیف پہنچانے کا ارادہ کرے یا (تمہیں تکلیف پہنچا سکے اگر) وہ تم پر رحم کرنے کا ارادہ کرے۔ اور وہ اللہ کے سوائے اپنے لیے نہ کوئی حمایتی پائیں گے اور نہ کوئی مددگار۔

قَدْ یَعْلَمُ اللّٰهُ الْمُعَوِّقِیْنَ مِنْكُمْ وَ الْقَآىِٕلِیْنَ لِاِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ اِلَیْنَا ۚ وَ لَا یَاْتُوْنَ الْبَاْسَ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۱۸﴾

اللہ تم میں سے روکنے والوں کو جانتا ہے اور اپنے بھائی بندوں سے کہنے والوں کو کہ ہماری طرف آجاؤ اور وہ لڑائی میں کم ہی آتے ہیں۔ (2638)

اَشِحَّةً عَلَیْكُمْ ۪ فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَیْتَهُمْ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْكَ تَدُوْرُ اَعْیُنُهُمْ كَالَّذِیْ یُغْشٰی عَلَیْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۚ فَاِذَا

تمہارے ساتھ بخل کی وجہ سے، پھر جب خوف آتا ہے تو انہیں دیکھتا ہے کہ تیری طرف دیکھتے ہیں ان کی آنکھیں گھومتی ہیں اس شخص کی طرح جس پر موت کی بے ہوشی

(ر) مگر [دیکھو نمبر: 509] بنو حارثہ اور بنو سلمہ جنگ احد میں شریک ہوئے تھے اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما اس سے [لَیْلَةُ الْعُقْبَةِ] کا عہد مراد لیتے تھے۔ مگر صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے **مراد وہ عہد ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری پر یہود اور مسلمانوں میں ہوا تھا**۔ جس کی رو سے سب فریق اس بات کے ذمہ دار تھے کہ اگر باہر سے کوئی دشمن مدینہ پر حملہ آور ہو تو اس کا دفاع سب ایک ہو کر کریں گے اور منافق بھی ان میں شامل تھے۔ اس معاہدہ کے یہ لفظ تھے [وَ اِنَّ بَیْنَهُمُ النَّصْرُ عَلٰی مَنْ هُمْ یَثْرِبَ]۔

2638- ﴿الْمُعَوِّقِیْنَ﴾ مُعَوِّقِیْنَ. عَوْقٌ سے ہے اور عَائِقٌ وہ ہے جو اس سے پھیر دے جو کسی بھلائی کا ارادہ کیا جائے۔ اور ﴿الْمُعَوِّقِیْنَ﴾ سے مراد بھی وہی لوگ ہیں جو نیکی کے رستے سے روک دیں اور یَعُوْقَ بت کا نام ہے۔ (غ)

ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ ؕ وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۱۹﴾

آجائے۔پس جب خوف جاتا رہتا ہے تو مال کے بخل سے تیز زبانوں سے تم پر طعن کرتے ہیں۔ یہ لوگ ایمان نہیں لائے، سو اللہ نے ان کے عملوں کو برباد کر دیا اور یہ اللہ پر آسان ہے۔(2639)

يَحْسَبُوْنَ الْاَحْزَابَ لَمْ يَذْهَبُوْا ۚ وَ اِنْ يَّاْتِ الْاَحْزَابُ يَوَدُّوْا لَوْ اَنَّهُمْ بَادُوْنَ فِى الْاَعْرَابِ يَسْاَلُوْنَ عَنْ اَنْۢبَآئِكُمْ ؕ وَ لَوْ كَانُوْا فِيْكُمْ مَّا قٰتَلُوْٓا اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۲۰﴾ ع 2 12 18

وہ خیال کرتے ہیں کہ (کفار کی) جماعتیں نہیں گئیں اور اگر وہ جماعتیں (پھر) آجائیں تو آرزو کریں گے کہ وہ دیہاتیوں میں جا کر صحرانشین ہو جائیں۔تمہاری خبریں پوچھتے ہیں اور اگر تمہارے اندر ہوں تو کم ہی جنگ کریں۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِىْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴿۲۱﴾

یقیناً تمہارے لیے اللہ کے رسول میں ایک نیک نمونہ ہے اس کے لیے جو اللہ اور پچھلے دن کی امید رکھتا ہے اور اللہ کو بہت یاد کرتا ہے۔(2640)

2639- ﴿اَشِحَّةً﴾ شَحِيْحٌ کی جمع ہے۔بخیل اور شُحٌّ کے لیے [دیکھو نمبر: 742]۔بخل جس کے ساتھ حرص ہو اور یہاں مراد ہے دشمن کے مقابل پر مال خرچ نہیں کرتے۔غنیمت پر حریص ہیں۔

﴿سَلَقُوْكُمْ﴾ سَلْقٌ۔ آواز کی سختی ہے۔حدیث میں ہے [لَيْسَ مِنَّا مَنْ سَلَقَ] (مسند أحمد، جلد32، صفحہ 303) جس سے مراد ہے وہ شخص جو موت کے وقت یا مصیبت کے وقت آواز بلند کرتا ہے۔اور [سَلَقَهُ بِلِسَانِهِ] کے معنی ہیں اسے ایسی بات سنائی جو وہ ناپسند کرتا ہے۔اور [سَلَقَهُ بِالْكَلَامِ] سے مراد ہے اسے کلام سے اذیت پہنچائی۔(ل)

﴿حِدَادٍ﴾ حَدِيْدٌ کی جمع ہے۔[دیکھو نمبر: 237] اور [لِسَانٌ حَدِيْدٌ] ایسا ہی ہے جیسا [لِسَانٌ صَارِمٌ] یعنی زبان جو کاٹتی چلی جائے اور یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب اس کی تاثیر حَدِيْدٌ یعنی لوہے کی ہو۔

2640- ﴿اُسْوَةٌ﴾ [دیکھو نمبر: 811] اور اُسْوَةٌ۔ قُدْوَةٌ یعنی پیشوا کے معنی میں بھی آتا ہے اور کہا جاتا ہے [لِيْ فِيْ فُلَانٍ اُسْوَةٌ] اور امور میں پیروی کرنا بھی اُسْوَةٌ ہے۔(ل)

وَ لَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ

اور جب مومنوں نے جماعتوں کو دیکھا انہوں نے کہا یہ وہ ہے جس کا وعدہ اللہ اور اس کے رسول نے دیا تھا اور

رسول اللہ ﷺ میں اسوۂ حسنہ کا ہونا اس موقعہ پر خصوصیت سے کیوں بیان کیا گیا؟ اس لیے کہ مصائب میں استقلال تمام اخلاق کی جان ہے اور یہ موقعہ اس استقلال کے دکھانے کا تھا جب دشمن اس قدر طاقت کے ساتھ کچلنے کے لیے آموجود ہوا کہ مسلمانوں میں اس کے مقابلہ کی کچھ بھی طاقت نہ تھی۔ یہی وہ موقعہ تھا کہ جب ظاہر تک محدود نگاہوں والے پکار اٹھے ﴿یٰۤاَهْلَ یَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ﴾ کہ نبی ﷺ نے خندق میں ایک پتھر کو توڑتے ہوئے فرمایا کہ مجھے قیصر اور کسریٰ اور یمن کے محل دکھائے گئے اور جبریل نے مجھے خبر دی ہے کہ میری امت ان پر غالب آئے گی۔ ایک اور وجہ اس مضمون کے یہاں لانے کی یہ ہے کہ اصل مضمون تو یہی ہے کہ مومن رسول اللہ ﷺ سے کیا تعلق رکھیں اور کیا سیکھیں۔ اسی اثنا میں جنگ احزاب کا ذکر آ گیا اور اس ذکر کے اندر اصل مضمون کی طرف رجوع کیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ ہونے کا کیا مطلب ہے؟ دوسری جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق اسی قسم کے الفاظ ہیں ﴿قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ وَ الَّذِیْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ﴾ [الممتحنة: 4:60] یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھی تمہارے لیے اس بارہ میں اسوۂ حسنہ ہیں کہ جب انہوں نے اپنی قوم کو دیکھا کہ وہ عداوت حق میں حد سے بڑھ گئی ہے تو ان سے تعلقات قطع کر لیے۔ تو یہ ایک خاص امر میں اسوۂ حسنہ ہونا ہے۔ لیکن یہاں آنحضرت ﷺ کا اسوہ حسنہ ہونا نہ صرف عام کر کے یہ بتا دیا کہ آپ تمام امور میں اسوۂ حسنہ ہیں بلکہ اس کے بعد الفاظ ﴿لِّمَنْ كَانَ یَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْیَوْمَ الْاٰخِرَ﴾ بڑھا کر بتا دیا کہ آپ ہر اس شخص کے لیے اسوۂ حسنہ ہیں جو اللہ اور یوم آخر کی امید رکھتا ہو۔ گویا تمام قوموں اور تمام زمانوں اور تمام قسم کے آدمیوں کے لیے آپ اسوۂ حسنہ ہوئے۔ جس طرح قرآن کریم کل مخلوق کے لیے ہدایت ہے، **اسی طرح آپ ساری نسل انسانی کے لیے اسوۂ حسنہ ہیں**۔ گویا قرآن کریم کی تعلیم الفاظ سے ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ کا وجود اسی تعلیم کا عملی نقشہ ہے۔ اور آپ سب قسم کے انسانوں کے لیے اسوۂ حسنہ نہ ہو سکتے تھے جب تک کہ آپ خود جملہ حالات انسانی میں سے نہ گزریں۔ اگر آپ متاہل نہ ہوتے تو آپ ایک نادر کے لیے اسوۂ حسنہ نہ ہو سکتے تھے۔ بالفاظ دیگر جو بات ہر انسان کو پیش آنے والی تھی اسی میں آپ کا نمونہ نہ ہوتا۔ اگر آپ صاحب اولاد نہ ہوتے تو آپ کسی کے باپ کے لیے اسوۂ حسنہ نہ ہو سکتے تھے۔ آپ کے والد اور والدہ گو فوت ہو چکے تھے مگر آپ نے اپنے چچا ابو طالب سے وہی سلوک کر کے دکھایا جو بیٹا باپ سے کرتا اور آپ کی رضاعی والدہ جب آپ سے ملنے آئیں تو آپ نے والدہ کی طرح ہی ان کی عزت کی۔ پھر انسان پر جو مختلف حالتیں آتی ہیں وہ یتیمی کی حالت سے لے کر جو انتہائی بے کسی کی حالت ہے بادشاہی تک ہیں، جہاں پہنچ کر انسان نخوت و تکبر کا شکار ہوتا اور طاقت کے نشہ میں سب کے حقوق کو پامال کرتا چلا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یتیمی سے لے کر بادشاہی تک پہنچایا اور ان دونوں حالتوں کے اندر اور جس قدر حالات انسان پر آتے ہیں ان سب میں سے گزارا۔ پھر آپ کو جنگ

صَدَقَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ ۫ وَ مَا زَادَهُمْ اِلَّاۤ اِیْمَانًا وَّ تَسْلِیْمًا ﴿۲۲﴾

اللہ اور اس کے رسول نے سچ کہا تھا۔ اور اس نے انہیں صرف ایمان اور فرمانبرداری میں بڑھایا۔ (2641)

پیش نہ آتے تو آپ کا اسوۂ حسنہ ہونا ایک ایسے پہلو میں ناقص رہ جاتا جس کی ضرورت دنیا میں ہر قوم اور ہر زمانہ میں پیش آتی رہتی ہیں۔ اور اس حالت میں آپ کی زندگی میں اگر ایک جرنیل کا نمونہ پایا جاتا ہے تو ایک سپاہی کا نمونہ بھی موجود ہے۔ پھر بادشاہت کی حالت میں آپ خود قانون سازی کرنے والے تھے، خود اس قانون کے ماتحت جج اور قاضی کا کام کرنے والے تھے۔ خود انتظامی معاملات کو طے کرنے والے تھے، خود معاملات ملکی کو سرانجام دینے والے تھے۔ پس مقنن کے لیے، ایک جج کے لیے، ایک انتظامی عہدیدار کے لیے، ایک مدبر ملکی کے لیے آپ کی زندگی میں نمونہ موجود ہے اور باوجود بادشاہت اور افسری کے آپ نے ادنیٰ سے ادنیٰ کام ٹوکری اٹھانا، پھاوڑا چلانا، جوتی اور کپڑے کی مرمت کرنا، برتن دھو لینا، دودھ دوہ لینا، بازار سے سودا لے آنا، اپنے ہاتھ سے کر کے دکھائے۔ جس میں ہر قسم کے مزدوری پیشہ آدمی کے لیے آپ نمونہ ہیں۔ پھر دشمنوں کے ہاتھ سے طرح طرح کے دکھ اٹھا کر آپ صبر و استقلال کا نمونہ بھی بنے اور انہی ظالموں پر فتح پا کر کامل عفو و رحم کا نمونہ بھی بنے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگی میں ہم ان میں سے کون سا نمونہ تلاش کریں؟ نہ آپ کو ان حالات میں سے گزرنا میسر آیا، نہ آپ ان حالات میں سے کسی کے لیے نمونہ کہلا سکتے ہیں۔ یہی حالت دیگر انبیاء علیہم السلام کی ہے کہ بعض انبیاء ایک حالت کے لیے نمونہ ہیں اور بعض دوسری کے لیے، بعض نے ایک خلق کا کمال دکھایا بعض نے دوسرے کا۔ لیکن نہ جملہ حالات کسی نبی کی زندگی میں جمع ہوئے، نہ جملہ اخلاق فاضلہ میں کوئی نمونہ بنا۔ یہ فخر کل عالم میں صرف ایک کو میسر آیا اور اسی لیے وہ سرور عالم اور فخر بنی نوع انسان اور اسوۂ حسنہ ہوا۔

2641- **ایک بین الثبوت معجزہ:** ﴿هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ﴾ صاف کسی پہلی پیشگوئی کی طرف اشارہ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ اشارہ سورۂ بقرہ کی اس آیت کی طرف ہے ﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا یَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَ الضَّرَّآءُ وَ زُلْزِلُوْا حَتّٰى یَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ﴾ [البقرۃ: 214:2] ''کیا تم خیال کرتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے اور ابھی تمہیں ان لوگوں کی سی حالت پیش نہیں آئی جو تم سے پہلے گزر چکے، ان کو سختی اور دکھ پہنچے اور خوب ہلائے گئے یہاں تک کہ رسول اور وہ لوگ جو ان کے ساتھ ایمان لائے تھے بول اٹھے کہ اللہ کی نصرت کب آئے گی؟'' لیکن اس سے زیادہ صاف یہ مکی پیشگوئی ہے ﴿جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ مِّنَ الْاَحْزَابِ ﴿۱۱﴾﴾ [صٓ: 11:38] ''یہ بھی ایک شکست خوردہ لشکر (اگلے) لشکروں سے ہے۔'' جہاں احزاب کا، ان کے لشکروں کا اور ان کی ہزیمت کا ذکر ہے۔ پس احزاب کا لشکر لے کر آنا مومنوں کے لیے نشان تھا کہ اب یہ بھاگ بھی جائیں گے۔ قرآن کریم کی یہ پیشگوئی جو مکہ میں بے کسی کی حالت میں کی گئی تھی مدینہ میں اتنے سال بعد اس صفائی سے پوری ہوتی دیکھ کر صحابہ رضی اللہ عنہم کے ایمان میں کس قدر ترقی ہوئی ہوگی اور پھر اس ترقی ایمانی کا نتیجہ ہی ان کی فرمانبرداری میں اور بڑھ کر قدم اٹھانا تھا۔ کسی پیغمبر کی زندگی

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖۗ وَ مَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴿۲۳﴾

مومنوں میں سے کچھ مرد ہیں جنہوں نے سچ کر دکھایا جو اللہ سے عہد کیا تھا۔ سو ان میں سے بعض وہ ہیں جنہوں نے اپنی نذر کو پورا کر دیا اور بعض ان میں سے وہ ہیں جو انتظار کرتے ہیں اور اپنی بات نہیں بدلی۔ (2642)

لِّيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَ يُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۲۴﴾

(یہ اس لیے ہوا) تاکہ اللہ صادقوں کو ان کے صدق کا بدلہ دے اور منافقوں کو اگر چاہے عذاب دے یا ان پر رجوع برحمت کرے۔ اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ (2643)

وَ رَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ

اور اللہ نے کافروں کو ان کے غصے میں لوٹا دیا انہوں نے

میں، دنیا کے کسی مذہب کی تاریخ میں اتنا بڑا معجزہ جو اپنے ساتھ اس قدر بین ثبوت رکھتا ہو تلاش کرنا بے سود ہے۔ آج مسلمان بھی اگر ان واقعات پر غور کریں تو ان کے ایمان بڑھ کر ان کا قدم فرمانبرداری میں اٹھے اور وہ دین و دنیا کی نعمتوں سے مالا مال ہوں۔

2642- ﴿نَحْبَهٗ﴾ نَحْبٌ۔ نَحْبٌ اور نَحِيْبٌ اصل میں رونے میں آواز کا بلند کرنا ہے اور عظیم الشان معاملہ کو اور نذر کو اور موت کو بھی نَحْبٌ کہا جاتا ہے۔ (ل) اور نَحْبٌ وہ نذر ہے جس کے وجوب کا حکم جاری کیا گیا ہو۔ (غ)

اس آیت میں **صحابہ کی کمال وفاداری** کا ذکر کیا ہے۔ گویا اپنی جانوں کو اللہ کی راہ میں دے دینا انہوں نے نذر مانی ہوئی تھی۔ پس جس شخص نے اللہ کی راہ میں جان دے دی اس نے تو گویا اپنی نذر پوری کر دی اور جو ابھی زندہ ہیں وہ بھی موت کے ان نظاروں کو دیکھ کر بدل نہیں گئے بلکہ وہ اس انتظار میں ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں بھی وہ موقعہ دے کہ اپنی جانیں خدا کی راہ میں دیں۔ ان دونوں میں فی الحقیقت کوئی فرق نہیں۔ اور یہ جو فرمایا ﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ﴾ تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ بعض مومن ایسے بھی ہیں کہ انہوں نے عہد کر کے پورا نہیں کیا۔ کیونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کوئی شخص ایسا نہیں جس نے عہد کر کے اسے پورا نہ کیا ہو۔ یہ اس لیے کہا کہ منافق بھی مومنوں میں ملے ہوئے تھے۔ اور اگلی آیت میں ان کو الگ الگ کر کے اس کی طرف اشارہ بھی کر دیا ہے اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ الْمُؤْمِنِيْنَ میں قیامت تک آنے والے مومن مراد ہیں اور رِجَالٌ میں خصوصیت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف اشارہ ہے۔

2643- منافقوں کے لیے توبہ کی خبر صاف بتاتی ہے کہ آخر ان میں سے بہت سے لوگ راہ راست پر آ جائیں گے اور ایسا ہی ہوا۔

يَنَالُوْا خَيْرًا ؕ وَ كَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا ﴿۲۵﴾

کوئی بھلائی حاصل نہ کی اور جنگ میں اللہ مومنوں کے لیے بس ہوا اور اللہ طاقتور غالب ہے۔ (2644)

وَ اَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ وَ قَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ وَ تَاْسِرُوْنَ فَرِيْقًا ﴿۲۶﴾

اور انہیں جنہوں نے اہل کتاب میں سے ان کی مدد کی تھی ان کے قلعوں سے نکال دیا اور ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا، ایک فریق کو تم قتل کرتے تھے اور ایک فریق کو قید کرتے تھے۔ (2645)

2644- ﴿كَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ﴾ میں بتایا کہ مومنوں کو جنگ کی ضرورت پیش نہ آئی اور اللہ تعالیٰ نے دشمن کی ہزیمت کے لیے اور اسباب پیدا کر دیئے۔

2645- ﴿صَيَاصِيْهِمْ﴾ صَيَاصِيْ. صِيْصَةٌ کی جمع ہے۔ اور یہ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے اپنے آپ کو محفوظ کیا جائے۔ اس لیے گائے کے سینگ کو بھی صِيْصَةٌ کہتے ہیں۔ (غ)

قبائل یہود اور مسلمان:

اہل کتاب میں سے یہ کفار کی مدد کرنے والے بنو قریظہ تھے۔ مدینہ میں یہودیوں کی تین قومیں آباد تھیں۔ بنو قینقاع، بنو نضیر، بنو قریظہ۔ ان تینوں نے شروع میں آنحضرت ﷺ سے معاہدہ کیا تھا جس میں یہ وعدہ تھا کہ مدینہ پر کوئی دشمن حملہ آور ہو تو وہ اپنی جان و مال سے اس کا مقابلہ کریں گے۔ مگر بعد میں آپ کی ترقی کو دیکھ کر ان کا حسد ترقی کرتا گیا اور مسلمانوں کے ساتھ ان کی دشمنی ہوگئی۔ بنو قینقاع ان سب میں چھوٹی قوم تھی۔ پہلے انہی کا جھگڑا مسلمانوں کے ساتھ ہوا، آخر اعلان جنگ کر کے یہ قلعہ گزیں ہوگئے۔ پندرہ دن تک محاصرہ رہا، اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کے فیصلہ پر راضی ہوگئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ مدینہ چھوڑ دیں۔ چنانچہ یہ شام کے علاقہ میں جا آباد ہوئے۔ یہ جنگ بدر سے ایک ماہ بعد کا واقعہ ہے۔ بنو نضیر نے باوجود معاہدہ کے شروع سے قریش سے ساز باز رکھی تھی۔ ایک دفعہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو قتل بھی کرنا چاہا مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کی حفاظت کی۔ ان کے کھلے دشمنی کے فعل دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے تجدید معاہدہ کے لیے انہیں کہا مگر انہوں نے انکار کیا، آخر ان کے ساتھ جنگ کی نوبت پہنچی اور وہ محصور ہوئے۔ تصفیہ اس پر ہوا کہ مدینہ چھوڑ جائیں اور جو مال وغیرہ ساتھ لے جا سکتے ہیں لے جائیں۔ ان کا ایک حصہ خیبر میں جا آباد ہوا۔ جنگ احزاب میں قریش اور قبائل عرب کو اکسانے میں ان لوگوں نے بڑا کام کیا۔ بنو قریظہ کو بھی جواب تک اپنے عہد پر قائم تھے انہوں نے اکسایا اور حُیَیّ ان کے سردار کے سمجھانے پر کہ مسلمان اس جرار لشکر سے جو اُن پر آرہا ہے اب بچ نہیں سکتے۔ **بنو قریظہ بھی آخر مسلمانوں کے دشمنوں کے ساتھ مل گئے**۔ ان کا مدینہ کے اندر ہو کر قریش کو مدد

وَ اَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَ دِيَارَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ وَ اَرْضًا لَّمْ تَطَـُٔوْهَا ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرًا ﴿۲۷﴾ ع 3 7 19

اور تمہیں ان کی زمین اور ان کے گھروں اور ان کے مالوں کا وارث بنایا اور ایسی زمین کا (بھی) جس پر تم نے (ابھی) قدم نہیں رکھا اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (2646)

پہنچانا ﴿ظَاهَرُوْهُمْ﴾ سے صاف ظاہر ہے۔ بلکہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کی مستورات پر بھی حملہ کرنا چاہا۔ یہ موقعہ مسلمانوں کے لیے نہایت نازک تھا جب کفار کا لشکر پراگندہ ہو گیا تو نبی کریم ﷺ نے بنوقریظہ کی سزا کے لیے فوراً ان کا محاصرہ کیا۔ کوئی پچیس دن تک ان کا محاصرہ رہا، آخر انہوں نے درخواست کی کہ **سعد بن معاذؓ جو فیصلہ کریں** وہ ہمیں منظور ہے۔ سعد ان کے حلفا میں سے تھے۔ اگر نبی ﷺ کے فیصلہ پر یہ لوگ راضی ہو جاتے تو آپ غالباً ان سے وہی سلوک کرتے جو پہلے بنوقینقاع اور بنونضیر سے کیا تھا۔ مگر سعد کو ان کی خطرناک غداری پر بہت رنج تھا کہ انہوں نے مسلمانوں کی عورتوں اور بچوں تک کو تہ تیغ کرنے کا عزم کر لیا تھا۔ اس لیے انہوں نے یہ فیصلہ دیا کہ ان کے مرد جو جنگ کے قابل ہیں وہ قتل کر دیئے جائیں، عورتیں اور بچے قید ہوں۔ یہ وہی فیصلہ تھا جو یہود اپنے دشمنوں کے حق میں عائد کرتے تھے۔ چنانچہ توریت میں ہے کہ جب محاصرہ تک نوبت پہنچ جائے اور

> ''خداوند تیرا خدا اسے تیرے قبضے میں کر دیوے تو وہاں کے ہر ایک مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر مگر عورتوں اور لڑکوں اور مواشی کو اور جو کچھ اس شہر میں ہو اس کا سارا لوٹ اپنے لیے لے۔'' [استثناء: 14-20:13]

اس لیے نبی کریم ﷺ نے اسی فیصلہ کو جو نہ صرف ان کے اپنے پیش کردہ منصف کا تھا بلکہ ان کی اپنی آسمانی کتاب کے مطابق بھی تھا ان کے حق میں عائد کیا، اور اختلاف روایات پر تین سو سے لے کر آٹھ سو نو آدمی تک قتل ہوئے۔ اس فیصلہ کی بنا پر رسول اللہ ﷺ پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا، نہ آپ کا یہ فیصلہ تھا، نہ آپ کی شریعت کے مطابق تھا۔ بلکہ یہودیوں کے مقرر کردہ ثالث کا اور انہی کی شریعت کے مطابق فیصلہ تھا۔

2646- **عرب سے باہر کی زمینوں کی فتح کی پیشگوئی:** وہ زمین جس پر تم نہیں چلے۔ کسی نے کہا مکہ، کسی نے خیبر، کسی نے فارس و روم۔ (ج) اور ظاہر ہے کہ پہلے دونوں خیال درست نہیں۔ اس لیے کہ مکہ اور خیبر ایسے مقامات نہیں جہاں مسلمان پہلے چلے نہ ہوں۔ مراد اس سے صاف طور پر وہ دور دراز کے ممالک ہیں جن پر اہل عرب عموماً جاتے بھی نہ تھے۔ اس لیے پیشگوئی کا ایک ایسے وقت میں کرنا جب جنگ احزاب میں قریب تھا کہ مسلمانوں کا نام و نشان مٹ جاتا اس کے منجانب اللہ ہونے کا بین ثبوت ہے۔ ایک طرف دشمن اس کثیر تعداد میں حملہ آور ہوتا ہے کہ جس کے حملہ کو روکنے کی مسلمانوں میں کوئی طاقت نہیں اور دوسری طرف پیشگوئی یہ کی جاتی ہے کہ تم ایسے ملکوں کو فتح کرو گے جن پر تمہارا قدم بھی کبھی نہیں گیا۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَ اُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ﴿۲۸﴾

اے نبیؐ! اپنی بیویوں سے کہہ دے کہ اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی زینت کو چاہتی ہو، تو آؤ میں تمہیں سامان دوں، اور تمہیں اچھی طرح سے رخصت کر دوں۔ (2647)

2647- بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ازواج مطہرات کے متعلق یہ مضمون یہاں بے تعلق شروع ہو گیا ہے، لیکن ایسا نہیں۔ ایک تعلق تو اس مضمون کا یہ بھی ہے کہ اس رکوع میں آنحضرت ﷺ کی بیبیوں کے آپ سے سامان دنیوی یعنی اچھے کپڑے، زیورات وغیرہ طلب کرنے کا ذکر ہے۔ اور اس کی وجہ یہی تھی کہ مسلمانوں میں فتوحات سے اور مال غنیمت کے آنے سے کچھ آسودگی آ گئی تھی اور نبی کریم ﷺ کی بیبیوں نے بھی چاہا کہ ان کو بھی آسودگی سے حصہ ملے۔ آپ کے گھروں میں کوئی سامان نہ تھا، بیبیوں کے پاس کوئی قیمتی کپڑے یا قیمتی زیورات نہ تھے، گزارہ بھی تنگ تھا۔ یہاں تک کہ بعض وقت فاقے بھی برداشت کرنے پڑتے تھے۔ تو اس لحاظ سے بھی یہ مضمون یہاں آیا ہے۔ لیکن اصل تعلق اس مضمون کا اس سے بھی زیادہ گہرا ہے۔ جنگوں کا ذکر درمیان میں بطور جملہ معترضہ آ جاتا ہے۔ پچھلے رکوع میں فرمایا تھا کہ نبی کریم ﷺ امت کے لیے اسوۂ حسنہ ہیں، اور گو آپ سب حالات میں سے گزرے اور ہر حالت میں انسانوں کے لیے اسوۂ حسنہ بنے۔ مگر وہ امور جو خاص عورتوں سے تعلق رکھتے ہیں وہ آپ پر وارد نہ ہو سکتے تھے۔ اس لیے اس حصہ میں **نبی کی بیبیاں بھی امت کی عورتوں کے لیے نمونہ ہیں**۔ مثلاً پردہ کے احکام کی تعمیل میں امہات المؤمنین تمام مسلمان عورتوں کے لیے نمونہ ہیں۔ یا ان احکام کی تعلیم میں جو عورتوں کے مردوں کے ساتھ سلوک کے متعلق ہیں یا اس بات میں کہ باوجود عورت کے فرائض خانہ داری کو ادا کرنے کے عورتیں کس طرح قومی اور دینی ضروریات میں حصہ لے سکتی ہیں، اس کے علاوہ اور کئی امور ہیں جو خصوصیت سے عورتوں سے متعلق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں امت کی مائیں بھی قرار دیا ہے یعنی امت کی روحانی تربیت کا ایک حصہ ان کے بھی سپرد تھا۔ جس میں علاوہ اس خاص حصہ کے اور بھی بہت سے امور تھے جو نبی ﷺ کو گھر کے اندر پیش آتے تھے اور جن کا تعلق ہر مسلمان مرد اور عورت سے تھا۔ اس لیے اس رکوع میں ان کو ان کا یہ منصب یاد دلایا ہے۔ آسودگی سے زندگی بسر کرنا خلاف شریعت نہیں، نہ مردوں کے لیے نہ عورتوں کے لیے۔ لیکن جس طرح مردوں کے لیے نبی کریم ﷺ کا نمونہ سادگی کا تھا اسی طرح ضروری تھا کہ عورتوں کے لیے آپ کی بیبیوں کا نمونہ سادگی کا ہوتا۔ ورنہ سادگی کی جو تعلیم اسلام نے دی تھی اور جس کا نمونہ آنحضرت ﷺ نے دکھایا تھا وہ بے کار جاتا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ بہت سے اخلاق فاضلہ نسل انسانی کے اندر عورتوں سے آتے ہیں۔ وہ لوگ جھوٹے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ اسلام نے عورت کو عزت نہیں دی۔ اس سے بڑھ کر کیا عزت ہوگی کہ ایک حصہ میں انہیں اخلاق اور روحانیت کا معلم قرار دیا۔ اس اصول کو ابتدائی مسلمانوں نے خوب سمجھا تھا، ورنہ ہزارہا باتیں وہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور دیگر ازواج سے سیکھنے کے لیے کیوں جاتے۔ غرض جب ان پاک بیبیوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ان کی تکلیفات زندگی کی کسی قدر کم ہوں اور وہ بھی کسی قدر آسودگی کی زندگی بسر کریں اور دنیا کا کچھ مال ان کے گھروں میں بھی آئے تو حکم ہوا کہ اس سے تمہارے نبی کی بیبیاں ہونے کی اصل غرض ہی مفقود ہوتی ہے۔ اس لیے اگر دنیا کی زینت کے سامان چاہتی ہو تو وہ سامان دے کر تمہیں رخصت کر دیا جائے گا

وَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۲۹﴾

اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول کو اور آخرت کے گھر کو چاہتی ہو تو اللہ نے تم میں سے نیکی کرنے والیوں کے لیے بڑا اجر تیار کیا ہے۔ (2648)

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ؕ وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۳۰﴾

اے نبی کی عورتو! جو کوئی تم میں سے کھلی بے حیائی کرے اسے دو چند سزا دی جائے گی اور یہ اللہ (تعالیٰ) پر آسان ہے۔ (2649)

اور اگر تم رسول کے گھر میں رہنا چاہتی ہو اور اللہ اور اس کے رسول اور آخرت کے گھر کو اصل غرض بنانا چاہتی ہو تو پھر انہیں تکلیفات کے اندر زندگی بسر کرنی ہوگی، تاکہ تمہارے نیک نمونہ سے دوسروں کو فائدہ پہنچے۔ اور اس بات کا خصوصیت سے ذکر اس لیے بھی کیا کہ بی بی کا مطالبہ خاوند پر زیورات اور کپڑوں کے لیے سب سے زیادہ گھروں میں تکلیف کا موجب ہوتا ہے اور سب سے بڑا اسبق مسلمان بیبیوں کو یہی دینا تھا کہ وہ اپنے **خاوندوں سے ایسے مطالبات نہ کریں** جو اُن کے لیے تکلیف کا موجب ہوں۔ ہاں اگر کسی کو خود مل جائے تو بے شک اس سے فائدہ اٹھائے۔ انہی مطالبات نے یورپ کے بیشتر مردوں کو شادی سے متنفر کر کے زنا کاری کو مروج کر دیا ہے۔

2648- بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل کیں جن میں بیبیوں کو رسول کے گھر میں رہنے یا طلاق لینے کا اختیار دیا گیا، تو آپؐ نے مجھ سے ابتدا کی اور فرمایا کہ میں ایک بات تم سے کہتا ہوں مگر اس کے جواب میں جلدی نہ کرنا بلکہ اپنے ماں باپ سے مشورہ کر لینا۔ تب آپ نے یہ آیتیں پڑھیں۔ تو میں نے کہا میں ماں باپ سے کس بات کا مشورہ کروں میں اللہ اور اس کے رسول اور دار آخرت کو چاہتی ہوں۔ تب آپ نے باقی بیبیوں سے بھی اسی طرح دریافت کیا اور سب نے وہی جواب دیا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ جواب دے کر آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ میرے جواب کی اطلاع دوسری بیبیوں کو نہ دینا۔ تو آپ نے فرمایا کہ اللہ نے مجھے اس لیے نہیں بھیجا کہ لوگوں کو تکلیف میں ڈالوں، بلکہ مجھے معلم اور مبشر بنا کر بھیجا ہے۔ اگر مجھ سے کوئی بی بی دریافت کرے گی تو میں بتا دوں گا۔ اور یہ واقعہ **تخییر** کے واقعہ سے تعلق رکھتا ہے۔ یعنی جب نبی کریم ﷺ ایک ماہ کے لیے اپنی بیبیوں سے علیحدہ ہو گئے تھے اور یہ 9 ہجری کا واقعہ ہے۔

2649- ﴿بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ﴾ سے یہاں مراد بعض نے نبی ﷺ کی نافرمانی لی ہے اور بعض نے وہ امور جو آپ کی تکلیف اور حزن کا موجب ہوں۔ (ر) اور اس سے مراد نشوز اور سوء خُلق بھی ہوتے ہیں [دیکھو نمبر: 629]۔ اور زنا یہاں مراد نہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ کی عصمت آپ کو اس سے بلند ٹھہراتی ہے کہ آپ کی بیبیوں سے ایسے امر کا ارتکاب ہو اور بعض نے بطور فرضیت اس کو جائز رکھا ہے۔ اور ایسی حالت میں دو چند عذاب اس لیے کہا کہ وہ تو دوسروں کے لیے نمونہ ہیں۔